مُحبت مارچ کا موسم

سائرہ رضا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اتنے سال سے ایک ساتھ رہنے کے باوجود وہ کتنی الگ دکھائی دے رہی تھیں۔ اجنبی کٹھور۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے ان کے جملوں نے زیادہ تکلیف دی تھی یا ان کی آنکھوں سے جھلکتی اجنبیت نے دل کو توڑا تھا۔ اتنے سال۔۔۔ کتنے سال وہ غیرارادی طور پر انگلی کی پوروں پر حساب جوڑنے لگتے پر سب خلط ملط ہو جاتا تھا۔

جب دل و دماغ شدید انتشاری کیفیت میں آجاتے تب جسم کے افعال پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اٹھتے کہیں اور پڑتے کہیں جیسے قدم۔

ان کی خاموشی کو مزاج کہہ کر سالوں پہلے چھوٹ دے دی۔ الگ تھلگ انداز کو جھجک کے خانے میں

ڈال دیا، مگر یہ تو نہیں سوچا تھا۔ وہ خاموش اس لیے رہتی تھیں کہ اپنے آپ سے گفتگو کی عادی ہو چکی تھیں اور الگ تھلگ اس لیے تھیں کہ انہوں نے ان سب کو اپنا کبھی سمجھا ہی نہیں تھا۔

اور ایسی ہی کیفیت کے زیر اثر بڑی امی بھی تھیں مگر ان کی سوچ تھوڑا آگے جا کر ایک سوال پر اٹک گئی تھی۔ انہیں پہلی بات کا زیادہ دکھ ہوا تھا یا دوسری کا.... یا تیسری کا.... انہوں نے تیز تیز پلکیں جھپکیں کہیں آنسو چھلک نہ جائیں حالانکہ یہ خواہش بے وقوفی تھی۔ کوئی اندھا بھی بتا سکتا تھا۔

وہ انسان نہیں لگ رہی تھیں۔ مجسم آنسو جیسے.... موم بتی کی طرح جسے خود کبھی پتا نہیں ہوتا۔ وہ دھیرے دھیرے ختم ہو رہی ہے۔ پانی ہوتے ہوتے بھی اپنی ہی روشنی پر نازاں رہتی ہے ہوش تب آتا ہے جب بجھ چکی ہوتی ہے۔

لیکن نہیں۔ انہیں تو پتا لگ رہا تھا کہ وہ اندر سے ختم ہو رہی ہیں۔ ان کی نگاہیں بیٹے پر ٹک گئیں۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ ہاں وہ ہوگا اتنا بہادر، مگر وہ نہیں تھیں۔

ان کی بھری سوالیہ نگاہیں شوہر کی سمت اٹھیں، وہ بھی مسکرا رہے تھے۔

"امی! چائے۔" اور وہ چونک کر مڑیں۔ یہ ان کی بیٹی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ کمال ہے مسکرانا کیا اتنا آسان ہے۔

"باادب باملاحظہ ہوشیار شہزادی صاحبہ.... اپنی پہلی تنخواہ لے کر حاضر ہیں۔"

ان کی سوچوں کا سرا چھوٹ گیا۔ کھنکتی آواز پر سب چونک کر متوجہ ہوئے تھے آتشی گلابی دوپٹا قمیص کے ہمراہ سفید چوڑی دار پاجامہ، ذرا سی ہیل والی سیاہ جوتی۔ خوب صورت ہینڈ بیگ۔

"شہزادی۔ یہ تم نے اپنے لیے کہا ہے؟" معید کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"ہاں!" اس نے دانت پیسے اور ساتھ ہی اپنا بیگ اس کے کندھے سے ٹکرا دیا۔

"یہ تمہارا جملہ ہونا چاہیے تھا جل ککڑے۔ میں خود کفیل ہو گئی ہوں۔" وہ چمکتی آنکھوں سے سب کو دیکھتے ہوئے اپنا بیگ کھول رہی تھی۔ "اس میں اتنے نوٹ ہیں اتنے نوٹ۔" سفید لفافہ نکال کر اسے ہاتھوں میں تولا کہ اس کا وزن دیکھو تم۔ وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھی۔ لفافہ اچھال رہی تھی اوہ۔ اس کی جھولی میں نوٹ گر گئے کچھ زمین پر گرے۔

"ہائے۔" اس نے سب کو شرمندگی سے دیکھا۔

"او چھے جٹ کٹورا بھیا، پانی پی پی اپھریا۔" معید اس سے زیادہ وہ فی البدیہہ اور کیا ہوتا؟ (ندیدے جٹ کو پیالہ ملا اس نے پانی پی پی کے پیٹ پھلا دیا)

"یہ تم نے مجھے کہا ہے۔" وہ نوٹ سمیٹنا بھول کر اسے گھورنے لگی۔

"دیکھ رہے ہیں آپ سب لوگ؟" اس نے باری باری سب کی صورتیں دیکھیں اور تب ہی وہ چونکی۔

"کیا بات ہے ایسے چپ کیوں ہیں؟ کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ کیا ہونا ہے۔" سب ایک ساتھ ایک جیسے جملے بول پڑے پھر جب نظریں آپس میں ملیں تو نگاہیں چرا گئے۔

(سب کچھ تو ہو گیا تھا بچا کیا تھا پیچھے۔)

"کوئی بات ہوئی ہے امی!" وہ پرسکون چہرہ لیے بیٹھی ماں کی سمت گھومی۔

"نہیں کیا ہونا ہے؟" انہوں نے اس کے گال پر شفقت سے ہاتھ رکھا تھا۔

"نہیں۔ مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے آپ لوگ کچھ چھپا رہے ہیں۔"

"نہیں بیٹا! بس حیران ہیں اتنے، بہت سارے نوٹ پہلے نہیں دیکھے نا۔" بڑے ابو نے بھولپن سے جتایا۔

"ہے ناں!" وہ فوراً خوش ہو گئی۔ "بہت سارے ہیں نا۔ تین مہینے کی تنخواہ ہے یہ۔"

"ماشاء اللہ۔" امی نے کہا۔

"آپ کچھ نہیں بول رہیں بڑی امی! آپ کو خوشی نہیں ہوئی۔" وہ اس کی ننھی ننھی باتوں کو سراہا کرتی تھیں تو اب ایسے کیوں۔

"جوش سے زیادہ حیران ہیں۔ پہلی تنخواہ کی اتنی قدر افزائی ماشاء اللہ۔" وہ پوچھ بڑی امی سے رہی تھی صفائی ان کی بیٹی کی جانب سے آئی۔ اس نے سمجھ کر لمبا سانس بھرا اور ہنس دی۔

"کیا کروں اتنے نوٹوں کی عادی نہیں نا۔ تو یہ سمجھ میں نہیں آتا میں اتنے سارے پیسوں کا کروں گی کیا؟ ہیں تم بتاؤ۔" بے نیازی سے کہتی وہ معید کی سمت گھومی جو نوٹ اکٹھے کرچکا تھا اور لفافے میں سلیقے سے بھر رہا تھا۔

"اپنی امی کو دو بیٹا!" بڑے ابو نے نرمی سے کہا۔ "ان کا حق ہے۔"

"ہاں۔" اس کی نگاہیں ماں کی جانب اٹھیں۔ وہ مان بھرے انداز سے ایک حق سے ایک فخر سے بیٹھی تھیں۔ ایک مسکراہٹ لبوں پر رقصاں تھی۔

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا' مگر اک سنجیدگی بھی چہرے پر آگئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر لفافہ لے لیا۔ "امی کے حق سے تو انکار نہیں۔" وہ تین قدم چل کے ان کے نزدیک آگئی پھر ماں کی سمت دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھیں' مگر ان کا انداز کچھ عجیب سا لگا۔ ناقابل فہم۔

"میں اپنی پہلی تنخواہ آپ کے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہوں ابو۔" وہ زمین پر ان کے گھٹنوں کے پاس بیٹھ گئی اور لفافہ ان کی جھولی میں ڈال دیا۔ یہ بالکل غیر متوقع صورت حال تھی۔ امی کا مسکراتا چہرہ یک دم تن گیا تھا انہیں جیسے اس چیز کی امید نہیں تھی۔ دوسری طرف ابو کو یوں لگا جیسے کسی نے گود میں جلتے کوئلے رکھ دیے ہوں۔ وہ دامن جھٹک کر کھڑے ہونے ہی والے تھے جب نگاہ پھر اس کے چہرے پر ٹک گئی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ احسان' مان' محبت' ایثار' حق و فرض کی باتیں۔

اس کا ایک ایک لفظ اس کے دل کی سچائی کا مظہر تھا اور صرف زبان ہی کیوں۔ اس کا چہرہ' اس کی آنکھیں سب اپنے کہے ہر لفظ کی ترجمانی کر رہی تھیں۔

مگر وہیں اس کی امی کا تنا چہرہ۔ اس پر ایک جتاتے طنز کی سلوٹیں اور استہزاء' ایک ناگواری و طیش انہیں یقیناً بیٹی کا یہ عمل پسند نہیں آیا اور وہ سارے خوب صورت جملے بھی جو ان کی بیٹی احسانات کے حوالے سے کہہ رہی تھی۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا امی!" اس نے یک دم ماں کو پکار لیا اور بڑی امی پہلی بار ششدر رہ گئیں۔ بیٹی کے مخاطب کرنے پر یک دم وہ نفرت' بے زاری' طنزیہ تحریر غائب ہو گئی تھی۔ وہ بیٹی کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھیں بیٹی کے اس عمل سے بہت خوش۔ اور اگر وہ کچھ لمحے پہلے ان کی حقیقت سے واقف نہ ہوئی ہوتیں تو دل کیسے خوشی سے بھر جاتا۔ (وہ انہیں عزت دیتی ہیں؟) ان کا دل بری طرح بے زار ہوا اور دکھی بھی۔

"نہیں۔ یہ ہم نہیں رکھ سکتے۔" وہ جگہ سے کھڑی ہو گئیں پھر خود ہی آگے بڑھ کر لفافہ شوہر کی گود سے اٹھا کر اسے تھمایا۔ "یہ تم اپنی ماں کو دو۔" اور اپنی بات کہہ کر وہ رکی نہیں تھیں۔ کمرے سے نکلتی چلی گئیں۔

حمیرا نے بری طرح چونک کر انہیں جاتا دیکھا تھا۔ پھر بڑے ابو کو۔ وہ مسکرا رہے تھے' اس نے ان دونوں بہن بھائیوں کو دیکھا۔ معید نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا جیسے کچھ نہیں ہوا' مگر بھائی کی بہن سمیرا' وہ ماں کے پیچھے چلی گئی تھی تپائی پر پڑی چائے کی ٹرے۔

"میں ذرا نماز کی تیاری کر لوں۔" بڑے ابو بھی کھڑے ہو گئے' اسے بھی کھڑا ہونا پڑا۔

"کیا ہوا ہے؟ سب خیر ہے ناں؟" وہ اسے دیکھنے لگی جو جھک کر تپائی کے نیچے سے ہزار کا نوٹ اٹھا کر اسے دے رہا تھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ آؤ چائے پیتے ہیں۔"

"نہیں۔" وہ پوری کی پوری ماں کی سمت گھومی۔

"امی! کچھ ہوا ہے نا۔ آپ کو تو آج شاید پھپھو کے گھر جانا تھا نا۔ انہوں نے کچھ کہا۔ "بتائیں نا؟" اسے بروقت یاد آیا۔ اپنی خوشی میں اتنی بڑی بات بھول گئی۔

وہ اسے جواب دیے بغیر کمرے سے چلی گئی تھیں۔

امی نے تو اسے کچھ نہیں بتایا۔ "کچھ نہیں ہوا۔ ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔" کہہ کر ٹال دیا۔ وہ سب کچھ جاننے پر مصر تھی، مگر امی کو ایک غائب دماغی کی سی کیفیت میں گھرا دیکھ کر پھر اس نے مزید سوالات کا ارادہ ترک کر دیا۔

سمیرا ہی سے پوچھے گی۔ اس نے جلدی جلدی کپڑے بدلے۔ ڈھیلا ڈھالا رنگ برنگا سوٹ اور کمرے سے بھاگی۔ پرس یونہی کھلا پڑا تھا اور تنخواہ والا لفافہ کسی فالتو کاغذ کی طرح اس نے لاپروائی سے ڈال دیا تھا۔ آج امی اس کی لاپروائی اور بے نیازی پر کچھ بولی نہیں تھیں۔ نجانے ان کا دھیان کدھر تھا۔ سمیرا ڈھیلے انداز سے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اسے اندر آتا دیکھ کر وہ بلاوجہ بیڈ کی درازیں کھولنے لگی۔ بڑی امی کے ہاتھ میں تسبیح ..... نظر ملنے پر اس نے دیکھا ان کی آنکھوں میں اتنی ویرانی تھی کہ دل کانپ جائے، مگر انہوں نے ترنت تاثرات بدلے تھے اور تسبیح سے دانے گرانے شروع کر دیے تھے۔

"اب کوئی مجھے بتائے گا کہ کیا معاملہ ہے؟"

"کون سا معاملہ۔ کوئی معاملہ نہیں ہے۔" سمیرا مسکرائی تھی۔

"وہی معاملہ جو چھپایا جا رہا ہے جبکہ سب جانتے ہیں مجھ سے کچھ بھی چھپایا نہیں جا سکتا۔"

"بالکل درست۔ ساری زندگی میری امی اور تمہاری خود کی امی کھانے پینے کی چیزیں چھپا چھپا کر رکھتی رہیں، مگر تم چوہیا کی طرح کترنے پہنچ ہی جاتی تھیں۔" وہ چونک کر آواز کے تعاقب میں گھومی۔

"اوہ۔" اس نے ہاتھ کمر پر ٹکائے۔ معید بھی کمرے میں موجود تھا کونے والے صوفے پر بیٹھا ہوا۔

"بڑی امی نے مجھ سے کبھی کوئی چیز چھپا کے نہیں رکھی۔ ہاں میری امی ضرور ایسے کام کرتی تھیں، وہ بھی اس لیے کہ انہیں خدشہ تھا میں موٹا بم بن جاؤں گی۔" اس کی صاف گوئی پر بڑی امی کا ہاتھ رکا تھا۔

"ہاں انہوں نے ہمیشہ اسے اپنی اولاد کی طرح چاہا تھا، مگر کیا واقعی اس نے اس چیز کو تسلیم کیا تھا۔ یا وہ بھی ماں کی طرح اداکارہ تھی۔ اداکارہ۔" ان کا ذہن الجھا۔

"منافقت کو اداکاری کہنا شاید صحیح نہیں" "اداکار تو خوش کرتا ہے واہ واہ پر مجبور کر دیتا ہے جبکہ منافق۔ وہ کیا کرتا ہے ہاں اداکار اور منافق میں بڑا باریک فرق ہے۔ اداکاری کے بارے میں ہم جانتے ہیں، یہ جو کچھ کہہ رہا ہے کر رہا ہے یہ برملا کسی کردار کو نبھا رہا ہے۔ جبکہ منافق کے بارے میں ہم جانتے نہیں ہیں کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ اداکاری ہے۔ اس کے دل میں کچھ اور ہے اور زبان پر کچھ اور۔"

"سچ اگر بڑی امی مجھے چھپا چھپا کر کھلاتی پلاتی نہیں۔ تو میں نے تو واقعی میں مر جانا تھا اور دیکھو میں کوئی موٹی ہوئی؟ بالکل بھی نہیں۔" اس نے اپنی قمیص کا سرا پکڑ کر ذرا سا گھوم کر دکھایا۔ معید کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑی۔ اونچی بندھی پونی کی وجہ سے اس کی پتلی لمبی گردن نمایاں ہو رہی تھی منہ دھو کر آئی تھی چہرے کا نکھرا پن ماحول کو تروتازہ کر رہا تھا۔

"دراصل امی فطرتاً ایک وہمی عورت ہیں۔" اس نے پُراسرار رازدارانہ انداز اپنایا۔

"کاش وہمی عورت ہی ہوتی۔" بڑی امی کا دل بولا۔

"وہ چاروں قل پڑھ کر پھونک مار دیتیں۔ تعویذ بنوا لاتیں۔ دل بدل جاتا، لیکن دھوکے کا علاج نہیں ہوتا۔ نفرت کا مرض بھی لاعلاج ہے۔ جوڑ توڑ کرنے والے کبھی خزانوں کے مالک نہیں بنتے بس اس خوش فہمی میں جیتے ہیں۔ ہم جمع کر رہے ہیں اندھا دھند۔ انہیں یہ بھی پتا نہیں لگتا جن سکوں کی حفاظت میں عمر گلا دی وہ

کب کے متروک ہو چکے۔ وہ بھروسے کے چرخے پر محبت کا دھاگہ کاتتی رہی اور وہ صفیہ۔ دھوکا بنتی رہیں تھان کے تھان۔ ڈھیر لگا دیے۔ ایک بنائی الٹی' ایک سیدھی' ایک تار بغض کا' ایک بدگمانی کا' ایک حسد کا۔

نفرت کی چادر مکمل ہوئی تو ہوا میں اچھال کر سب پر اوڑھا دی۔ سارے منظر دھندلے ہو گئے۔ انہیں حمیرا مجید کا بے ریا چہرہ بھی گدلا دکھائی دینے لگا۔ شک میں پڑ گئیں جو اسے دیکھے گئیں' جو چمکتی آنکھوں مسکراتے لبوں کے ساتھ مسلسل بول رہی تھی۔ نجانے کون سے قصے۔ اور معید کیسے انہماک سے اسے سن رہا تھا اور اس کے چہرے پر وہی خوشی تھی جو ہمیشہ اس کی جانب دیکھنے سے پیدا ہو جاتی تھی اور سمیرا جو گم صم ہو گئی تھی شام سے۔ وہ بھی اس کو سننے میں ایسی محو ہو چکی تھی سب بھول بھال گئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے کیسی قیامت ٹوٹی تھی۔ بات کرتے کرتے وہ زور سے ہنس دی تھی اور اس کی ماں بھی ایسے ہی ہنستی تھی' باوجود اس کے کہ وہ بہت کم ہنستی دیکھی گئی تھی' انہیں لگا حمیرا نہیں ہنس رہی۔ یہ اس کی ماں ہنس رہی ہے۔ ہاں یہ صفیہ ہنس رہی تھی ان پر۔ ان کی گرفت تسبیح پر سخت ہو گئی۔ حمیرا کا ہنستا چہرہ زہر لگنے لگا۔ ہنسی کی آواز کریہہ۔

"اس سے کہو معید۔ چپ ہو جائے۔" وہ چلا اٹھیں اور وہ تینوں بری طرح چونک پڑے۔

"امی!" سمیرا کی آواز میں اچنبھا تھا۔

"اس سے کہو سمیرا! اپنے کمرے میں چلی جائے فوراً۔" ان کا ہاتھ دروازے کی طرف لمبا ہوا اور چہرہ مخالف جانب مڑ گیا جیسے وہ صورت دیکھنا بھی نہیں چاہتیں۔

حمیرا بے یقینی سے چکرا اٹھی۔ اس نے دونوں بہن بھائیوں کو دیکھا۔ شہادت کی انگلی اپنے سینے پر رکھ کر جیسے تصدیق چاہی۔ "کیا میں؟"

"آپ مجھے نکل جانے کا کہہ رہی ہیں؟" وہ چند قدم ان تک بڑھ آئی پر یہ کیا؟ بڑی امی کی گردن مزید گھوم گئی۔

"امی پلیز۔" معید کے دو لفظوں میں گہری تادیب تھی۔

"ہاں' امی پلیز۔" سمیرا کے تین لفظ بھائی کی گزارش کی سفارش تھے۔

"کیا۔ ہو گیا۔ کوئی بات ہے؟" پہلی بار اس کی آواز میں لرزش تھی۔ بہت ٹوٹے لفظ۔ "میں نے کچھ کر دیا کیا؟ کوئی مجھے بتائے تو۔" وہ جست بھر کے بڑی امی کے عین سامنے آ گئی۔ اب منہ موڑ کر دکھائیں۔

"بتایا اسے جاتا ہے جو انجان ہو۔"

"مجھے واقعی کچھ نہیں معلوم۔ صبح آفس گئی تھی اور ابھی آئی ہوں۔ آپ بتائیے تو۔" اس نے لجاجت سے کہتے ہوئے ان کا ہاتھ تھاما' مگر۔۔۔ اف۔۔۔ انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔ حمیرا عبدالمجید کا ہاتھ بڑی امی نے؟

"اوہ۔" اس کی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر گئیں۔

"کچھ نہیں ہوا حمیرا! تم جاؤ۔" سمیرا اپنی جگہ سے اٹھ آئی۔

"کیوں نہیں کچھ ہوا۔" بڑی امی نے تسبیح رکھ دی۔ "اتنی محبت' اتنا مان' بھروسا' خلوص سب پر پھیر دیا ان ماں بیٹی نے۔ کون سی کمی چھوڑی تھی ہم نے محبت میں اور کبھی صلے کی امید نہیں رکھی۔ دونوں ہاتھوں کو دینے والا بنا دیا۔ کچھ سوچا بھی تو بھلے کا سوچا' جہاں لگا غلط ہو جائے گا۔ خود بخود پیچھے ہٹ گئے اس کا باپ قطع تعلق کر کے گیا تھا۔ کوئی خیر خبر نہیں رکھی۔ اس گھر سے اپنا حصہ لے گیا۔ اپنی الگ دنیا بسائی۔ تمہارے باپ نے اس پر بھی اعتراض نہ کیا اور پھر اس کے مرنے کی خبر سن کر کیسے اس نے منٹوں میں فیصلے کیے' کسی سے نہ پوچھا نہ بتایا اور میں نے ایک اچھی بیوی ہونے کے ناتے ان کے ہر فیصلے پر سر تسلیم کیا۔ تمہارے باپ نے کہا "آج سے اس گھر میں حمیرا کا وہی حصہ ہے۔ جو عبدالمجید کا حصہ تھا۔" میں بے ساختہ بولی۔ "عبدالمجید کا حصہ گھر میں' مگر وہ تو اپنا حصہ لے چکا ہے تو پتا ہے وہ کیا بولے۔"

"امی! یہ سب باتیں کیوں کر رہی ہیں۔" سمیرا ان کے برابر بیٹھ گئی۔

"ہاں امی۔ آپ ہی تو کہتی ہیں' کچھ باتیں کبھی نہیں دہراتے۔ خاص طور پر وہ جو فرض سے ہٹ کر احساس کے خانے کا حصہ ہوں۔"

معید نے نرم لہجے میں کہا۔ ماں کا ایسے پھٹ پڑنا اس کے لیے حیرانی تھی' انہیں روکنا ضروری تھا ورنہ وہ نجانے کہاں تک جاتیں' مانا کہ صدمے میں تھیں۔

"لیکن میں دہرانا چاہتی ہوں۔ اسے بتانا چاہتی ہوں کہ اتنے احسانوں کا بدلہ۔"

"امی! احسان کا لفظ استعمال نہ کریں۔" معید کی نظریں اس کے دھواں دھواں چہرے پر تھیں۔

"مجھے مت روکو' کہنے دو۔" بڑی امی کے آنسو ٹپک پڑے' اور یہ حمیرا کے لیے قیامت کا پل تھا۔ اس نے انہیں کبھی روتے نہیں دیکھا تھا کبھی بھی۔ ایسا کیا ہو گیا جو یہ سب ہو رہا تھا جو اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔

"معید ٹھیک کہہ رہا ہے۔ احسان کا لفظ مت ادا کریں۔" سمیرا بھائی کی ہم نوا تھی۔

"ٹھیک ہے۔" بڑی امی نے حلق تر کیا۔ ہتھیلی آنکھ پر بے دردی سے رگڑ دی۔ "میں نہیں کہتی احسان کا بدلہ۔ لفظ بدل دیتی ہوں اتنی محبت کا یہ بدلہ۔ یہ صلہ۔" وہ چپ ہوتے ہوتے رو پڑیں۔

"او خدا۔" حمیرا کرسی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھی۔

"میں نے کیا کیا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ پلیز تم لوگ بتا دو کہ۔" اسے رونا آ گیا' آواز بند ہو گئی۔ آنکھوں میں ہراس۔ شرمندگی اور لاعلمی۔

"ایسی کوئی خاص بات نہیں۔"

"کیسے خاص بات نہیں۔ بتاؤ اسے' اس کی پھپھی نے سمیرا کا رشتہ لینے سے انکار کر دیا ہے۔"

"انکار۔" حمیرا کا جھکا سر اٹھا۔ "تو اس میں میرا کیا قصور؟" اس کی آنکھوں سے سوال چھلکا۔ ساتھ ہی اسے غصہ آیا۔

"تو آپ مجھ پر ناراض کیوں ہو رہی ہیں اور پھپھی بھولی کا کیا دماغ خراب ہو گیا؟ آپ انہیں ایک چیخ مار دیتیں' الٹا خود رونے لگیں۔ میں خود پوچھ کر آتی ہوں کہ طبیعت ٹھیک ہے۔" وہ سب بھلا کر اپنی جون میں لوٹی تھی۔ اتنی سی بات پر۔

"یہ بھی پوچھ لینا کہ سمیرا کا منع کر کے تمہارا کیوں مانگ لیا۔"

وہ سر پر پلو ڈال رہی تھی' ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا۔

"میرا....."

"ہاں۔ اور ساتھ ہی اپنی ماں سے بھی سوال کر لینا کہ۔"

"امی!" بڑی امی کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ سمیرا نے اپنا ہاتھ ان کے ہونٹوں پر رکھ دیا تھا۔ حمیرا نے چونک کر اس عمل کو دیکھا۔

"کیا ابھی کچھ اور بھی باقی تھا' مگر کیا؟" اس نے باری باری تینوں کو دیکھا۔

"اوہ۔" اس نے لمبا سانس لیا۔ اب وہ سب کچھ اور بتانے والے نہیں تھے تو کوئی بات نہیں وہ خود معلوم کرے گی۔ پھپھی کی تو ایسی کی تیسی۔ ان کی ہمت کیسے ہوئی اس کے بارے میں ایسا سوچنے کی۔ وہ تیزی سے باہر نکلی اس بار پلو سر پر ڈالنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔

پھپھی کے گھر پر بڑا سا تالا منہ چڑا رہا تھا۔ پتا لگا پھپھی گاؤں روانہ ہو گئی تھیں ان کے سسرال میں کسی کا انتقال ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے بیٹا بھی ہمراہ تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ واپس تو گھر ہی آنا ہے نا۔" اس نے دروازے پر لگے بڑے سے تالے کو پکڑ رکھا تھا۔

"پھر دیکھو میں کیا کرتی ہوں۔ سمیرا کے لیے انکار کر دیا پہلے اس سوال کا جواب لوں گی اور پھر پوچھوں گی کہ میرا نام کس منہ سے لیا بلکہ اتنی ہمت کہاں سے پیدا کی کیا پھپھی جانتی نہیں کہ میں تو۔" وہ گھر کی جانب مڑی۔

✡ ✡ ✡

پھپھی کا رشتہ سے انکار اور ساتھ اس کا نام لینا

معمولی بات نہیں تھی۔ پوری بات جانے بغیر اسے چین نہیں آسکتا تھا۔ رات کھانے کے بعد وہ پھر آئی تھی۔ وہ تینوں آپس میں کسی سنجیدہ موضوع پر گفتگو کر رہے تھے اور اسے اپنے سر پر کھڑا دیکھ کر چونکے تھے۔ چلتے منہ بند ہو گئے تھے۔ سمیرا اور معید کے چہروں پر استقبالی مسکراہٹ آئی تھی۔ "ارے تم کب آئیں؟"

"کچھ دیر ہوئی۔" اس کی نگاہیں بڑی امی پر ٹک گئیں۔ جنہوں نے آنکھیں موندلی تھیں۔ چہرے سے طبیعت کی ناسازی کا پتا چل رہا تھا، مگر یہ رکھائی کیوں۔

"مجھ سے ناراض ہیں؟"

"اچھا وجہ تو بتادیں۔"

"پھپھی بھولی کی بات پر۔؟؟ وہ بھی کوئی خفا ہونے کی بات ہے؟ پھپھی کا تو دماغ۔" اس نے انگلی کے اشارے سے خرابی کا بتایا۔

"میں تو گئی تھی، مگر پھپھی کی قسمت اچھی۔ ایسی باتیں سنائی ایسی باتیں کہ۔" وہ جارحانہ انداز سے اپنے عزائم بتانے لگی، مگر یہ کیا بڑی امی کا چہرہ بے تاثر ہی رہا۔ اتنے سوالوں کا ایک جواب بھی نہیں۔

"آپ کچھ بولتیں کیوں نہیں بڑی امی؟"

"میرے سر میں درد ہے۔ تم جاؤ یہاں سے۔"

"آپ مجھے کمرے سے نکل جانے کا کہہ رہی ہیں۔" اور بڑی امی خاموش رہیں۔

"آپ لوگ میرے آنے سے پہلے باتیں کر رہے تھے اور اب چپ ہو گئے ہیں۔" بڑی امی سے مایوس ہو کر اس نے معید اور سمیرا کی جانب دیکھا۔

"ارے نہیں تو۔" دونوں بہن بھائیوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر یک زبان ہو کر کہا تھا۔

"میں بے وقوف نہیں ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے بتایا۔

"ہاں بیٹا!" دم سادھ کر لیٹی بڑی امی جیسے کرنٹ کھا کر اٹھ بیٹھیں۔ "بے وقوف تم نہیں ہو، پتا لگ گیا ہے۔ بے وقوف تو ہم ہیں جو اتنے سالوں تک۔" وہ نجانے کیا کیا بولنے لگیں۔

"آپ کل بھی ایسی ہی باتیں کر رہی تھیں بڑی امی۔ مجھے اشارے سمجھ میں نہیں آتے۔ میں ہمیشہ صاف بات کرتی ہوں اور یہ بات آپ ہی نے مجھے سکھائی تھی اور اب خود بھول رہی ہیں۔ مجھے معلوم ہے آپ غصہ ہیں دکھی ہیں۔ پھپھی بھولی نے میرا رشتہ مانگ لیا تو مانگنے دیں اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں اپنا رشتہ دوں گی ہی نہیں۔ اب وہ مجھے زبردستی اٹھا کر لے جانے سے تو رہیں۔"

وہ دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر تیقن سے بات کر رہی تھی۔ ساتھ ہی دونوں بہن بھائی سے تائید بھی چاہتی تھی۔

"اور ویسے بھی جہاں تک پھپھی بھولی کے ہونہار بیٹے کا سوال ہے۔ مجھے ان سے شادی کرنے میں کوئی انٹرسٹ ہی نہیں۔ بھلے سے جتنے مرضی قابل ہوں۔ بھئی جس شخص کا نام ہی مجھے پسند نہ ہو میں اس سے شادی کیسے کر سکتی ہوں تمہیں ہی مبارک ہو۔ پروفیسر اے ڈی ریاض "آگے ڈگریاں خود لگالو۔ مجھے تو یاد بھی نہیں رہتیں۔" اس نے لاپروائی سے ہاتھ چلایا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا معید۔ ان کا نام تو چھوڑو۔" اسے کچھ اور بھی یاد آیا۔ "ان کی تو شکل بھی میرے آئیڈیل سے ملتی نہیں ہے۔"

"ارے۔" معید کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"اتنے اچھے تو ہیں بھائی ریاض۔"

"ہاں.... مگر.... بھائی.... ریاض...." اس نے لفظ "بھائی" پر خصوصی زور دیا ساتھ ہی آنکھیں نچا کر سمیرا کو دیکھا جو مروتاً بھی مسکرا نہیں سکی۔ اسے یہ چیز پہلی بار بری طرح سے محسوس ہوئی۔ سمیرا کے چہرے پر بے رنگی تھی۔ آنکھوں میں اجاڑ پن اور ہونٹ خشک۔ صرف یہی نہیں روز کپڑے بدلنے والی نے پرسوں والا سوٹ پہن رکھا تھا۔ بال بھی نہیں بنائے گئے تھے اور سب سے بڑھ کر وہ ناخن کتر رہی تھی وہ جس کے حسین ہاتھ اور نفاست سے سجے بنے ناخن اس کی پہچان تھے تو واقعی اس نے صدمہ لگا لیا تھا۔

نہیں صدمہ نہیں۔

محبت چھننے کا خدشہ روگ لگا دیتا ہے۔ تو سمیرا روگی؟
دنیا چھوڑ دینے کا دل کرتا ہے۔ تو کیا سمیرا جوگی؟
نہیں نہیں۔ اللہ نہ کرے، جو وہ ایسے دنیا ہارے؟
دل کا ہار جانا بھی تو دنیا ہار دینے کے مترادف ہوتا ہے نا۔

اس کو ٹوٹ کر سمیرا کے ہنستے چہرے پر پیار آیا۔
جست لگا کر اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔ ایک ہاتھ اس کے شانے پر پھیلا لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا ملائم ہاتھ تھام کر اپنی ساری محبت' خلوص جیسے گرفت کی گرمائش میں سمیٹ دی۔

"بس تھوڑا سا صبر۔ ایک بار پھپھی بھولی تشریف لائیں پھر تم دیکھو ارے مجھے کوئی زبردستی اٹھا کر لے جائیں گی۔ دنیا میں کوئی مائی کا لال ایسا نہیں جو میری مرضی کے خلاف کچھ کر سکے' کس میں اتنی ہمت ہے جو سمیرا عبدالمجید کو۔"

"صفیہ چچی۔" سمیرا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"کیا صفیہ چچی؟" اس نے سر کو جھٹکا دیا تھوڑی بھی ہلائی۔

"صفیہ چچی نے پھپھی بھولی کو "ہاں" بھی کہہ دی ہے۔" سمیرا آدھے جملے پر اٹکی' مگر پھر اس نے بات مکمل کر دی۔ یوں لگا جیسے کانٹے نکل لیے ہوں۔

ادھر اس کے ہاتھوں کی گرفت اتنی ڈھیلی ہو گئی جیسے دم نکل گیا ہو۔

"ہاں۔" اسے اپنی آواز خود سنائی نہیں دی۔

"صفیہ چچی۔ مطلب امی نے کیا کر دی؟"

"پوری دنیا کو چھوڑ کر تمہاری ماں کو بھیجا تھا میں نے۔" بڑی امی ساری نقاہت بھول بھال کر اٹھ گئی تھیں "کہ بھولی آپا سے کہے' اب تو وہ اپنی چاروں بیٹیاں بھی بیاہ چکی گھر بھی بنا لیا۔ سجا لیے کمرے۔ بیٹے کی بری کے لیے ہار بندے اور چوڑیاں بھی بنوا کر گھر گھر دکھا دیں تو دن تاریخ طے کرنے میں کس چیز کی دیر کرتی ہے۔ بیٹی کی ماں اپنے منہ سے کہتی اچھی نہیں لگتی' مگر شرم' جھجک کے نام پر اس کی عمر کیوں ضائع کروں۔ پہلے ہی اللہ کی طرف سے دیر ہو گئی لیکن۔" بڑی امی نے ایک سانس میں طویل بات کر کے سانس بھری تو یوں لگا جیسے سسکی ہوں۔

"دونوں نے میری پیٹھ میں چھرا گھونپا۔ بھولی نے انکار کر کے اور صفیہ نے اقرار کر کے۔"

"امی کیسے اقرار کر سکتی ہیں۔" وہ بھونچکی رہ گئی تھی۔

"سارا قصور ہمارا ہی ہے۔ خلوص محبت کے سارے قصے کتابوں میں رہ گئے۔ میرا بھروسا ٹوٹ گیا اور وہاں سے ٹوٹا جہاں سے امید بھی نہیں تھی۔" اس کے سفید چہرے پھٹی آنکھوں کو مکمل طور پر فراموش کیے وہ خود سے ہم کلام تھیں۔ ٹوٹا لہجہ۔ متورم آنکھیں۔

اس کی نظریں سمیرا اور معید پر گئیں۔ وہ دونوں غیر مرئی نقطوں کو گھورتے ہوئے صاف لگ رہا تھا' ماں کے ہم خیال ہیں۔ اسے پہلی بار صورت حال کی گمبھیرتا کا اندازہ ہوا۔ انہونی کا احساس۔ یہ سب اس نے کیا سنا تھا' یقیناً "کوئی غلط فہمی ہی ہوگی۔

✲ ✲ ✲

"پھپھی بھولی کو چھوڑیں ان سے تو کچھ بھی توقع کی جا سکتی ہے پر آپ۔ آپ نے کس لیے ہاں کی۔ کس چیز کی ہاں۔ میرا رشتہ اور اے ڈی ریاض سے؟"

وہ خطرناک حد تک سنجیدہ مسلسل بول رہی تھی جبکہ صفیہ بے حد سنجیدہ تاثرات کے ساتھ جس میں سکون اور قطعیت کا عنصر نمایاں تھا۔ اسے سن رہی تھیں۔ وہ زچ ہو گئی۔ "آپ کچھ بولتی کیوں نہیں ہیں؟"

صفیہ نے ایک طویل سانس بھرا۔ "تم نے جو کچھ سنا ہے' وہ صحیح ہے۔"

"مطلب؟"

صفیہ نے جواب نہیں دیا۔ بیڈ پر کچھ دھلے کپڑے پڑے تھے' انہیں تہہ کرنے لگیں۔

"امی!" وہ ان کے عین سامنے آگئی۔ "میں آپ سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔"
"تو میں نے بتا دیا ناں۔" وہ ہاتھ سے شرٹ کی سلوٹیں دور کر رہی تھیں۔
"پھپھی بھولی نے سمیرا کے لیے منع کر دیا؟"
"ہاں۔"
"اور میرا رشتہ مانگ لیا؟"
"ہاں۔"
"اور آپ نے ہاں کر دی؟" اس کے ضبط کی انتہا تھی۔
"ہاں!" نگاہیں اٹھا کر بے خوفی سے اسے دیکھا۔ (کہو جو کہنا ہے۔ کر لو جو کرنا ہے)
"امی۔" وہ دھپ سے ان کے سامنے بیٹھی۔ "آپ کو اندازہ ہے آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ اور آپ کیا کر آئی ہیں۔"
صفیہ نے جواب نہیں دیا۔ کپڑے اٹھا کر الماری کی طرف بڑھ گئیں۔
"میں آپ سے کچھ پوچھ رہی ہوں امی۔" وہ پیچھے سے بولی۔ اس کی آواز بلند تھی۔
"میں تمہارا بھلا چاہتی ہوں حمیرا۔ بلکہ یاد رکھو اس پوری دنیا میں میں واحد ہوں جو تمہارا اچھا برا پورے خلوص سے سوچ سکتی ہوں۔" اس کے چہرے کی سرخی پر نظر ڈالتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔
"میرا بھلا چاہنے کے لیے آپ کسی اور کا بیڑہ غرق کر دیں گی۔"
"سمیرا کے لیے انکار بھولی آپا نے خود کیا ہے۔"
"تو آپ نے انہیں سمجھانے کے بجائے بڑھاوا دیا۔"
"بڑھاوے کی کیا بات ہے۔ اتنے اچھے رشتے کو کون پاگل ہاں منع کرے گی۔"
"لیکن پاگل بیٹی منع کر سکتی ہے ناں۔"
"تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گی حمیرا۔" صفیہ نے الرٹ ہو کر اسے تادیب کی۔
"امی! سمیرا کا رشتہ زمانوں سے طے ہے۔ اے ڈی بھائی کے ساتھ۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ بڑی امی ساری تیاریاں کیے صرف لڑکی کی ماں ہونے کی جھجک میں پھپھی سے سوال نہیں کر رہی تھیں۔ انہوں نے آپ کو بھیجا اور آپ نے۔" اس کے لہجے میں تاسف آمیز شرمندگی نمایاں تھی۔
"کیا آپ نے... میں نے تو بھولی آپا سے نہیں کہا' آپ سمیرا کو منع کر کے حمیرا کو لے لیں۔ یہ ان کا اپنا فیصلہ تھا۔ مجھے مناسب لگا تو میں نے قبول کر لیا۔" صفیہ کے انداز کی بے پروائی قابل دید تھی۔
"یہ میرے نرسری پریپ کے اسکول کی چوائس کا معاملہ نہیں ہے امی۔ میں چھوٹی بچی نہیں ہوں۔ آپ میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ یوں بالا ہی بالا طے کر رہی ہیں او خدا۔" اس نے گردن اٹھا کر چھت دیکھی۔
"بڑا ہونے کا مطلب ہے۔ نافرمانی۔ تعلیم نے زبان چلانا سکھا دیا۔" صفیہ نے بیٹی کی دلیل کو رتبے کے تحکم سے دبانا چاہا۔
"زبان نہیں چلا رہی امی۔ یاد کروا رہی ہوں۔ جو آپ بھول گئی ہیں۔ بجائے اس کے آپ پھپھی کو دو ٹوک جواب دیتیں۔ بلکہ انہیں چار سنا کر آتیں کہ ان کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ سمیرا کے لیے انکار کریں۔ اتنے سالوں کی منگنی۔ خود چار چار بیٹیوں کی ماں ہوتے ہوئے وہ کسی کی بیٹی کا یوں تماشا کیسے بنا سکتی ہیں۔ اور ہاں..." اسے کچھ یاد آیا۔ "بھائی ریاض کدھر تھے۔ انہوں نے منہ پر بند نہیں باندھا ماں کے۔"
"بھولی کے آگے کس کی چلتی ہے؟" صفیہ نے خود کو نئے ضروری کام میں مصروف کر لیا تکیے کا غلاف بدلنے لگیں۔
"آپ کے کہنے کا مطلب ہے' یہ سب بھائی ریاض کی رضامندی سے کیا انہوں نے؟" وہ پہلی بار ٹھٹکی۔
صفیہ نے جواب نہیں دیا۔ بدستور لگی رہیں۔
"یہ ہو ہی نہیں سکتا۔" چند پل کے توقف کے بعد اس نے پریقین انداز سے گردن نفی میں ہلائی۔ "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"
وہ ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے۔ اور یہ کوئی

محبت کی لازوال داستان نہیں تھی۔ مگر محبت تو تھی۔ پسندیدگی وابستگی، روشنی، خوشبو، ہوا، بادل، محبت کے استعارے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ کن انکھیوں کی چوری جسے ہر ایک پکڑ بھی لے اور انجان بن جائے۔ تو پھپھی کو کیا سوجھی۔ اوہ پھپھی کو تو چھوڑو۔" وہ اچھلی اسے دوسرا اہم نقطہ یاد آیا۔ جو اس کی زندگی سے جڑا تھا۔

"ممیرا! اے ڈی کے معاملے کو تو چھوڑیں۔ آپ نے پھپھی سے یوں کیوں کہا کہ آپ راضی ہیں۔ آپ کیسے راضی ہو سکتی ہیں۔ آپ نے سوچا بھی کیسے کہ میں بھائی ریاض سے شادی کروں گی۔"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ مجھے مناسب لگا، میں نے ہاں کردی۔" صفیہ کا لہجہ بے تاثر تھا۔ حمیرا کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔ عجیب سے تاثرات۔ وہ نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"یہ شادی تو کبھی نہیں ہو سکتی۔ میں بھائی ریاض سے شادی کر ہی نہیں سکتی۔"

"کیوں؟" اس کے قطعیت سے بھرپور انداز پر صفیہ پہلی بار چونکی تھیں۔ مگر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ حمیرا کی نگاہوں میں سرد سا تاثر گہرا ہونے لگا۔

"ہاں بولو۔ اے ڈی سے نہیں کرنی تو کس سے کرنی ہے؟" وہ ڈپٹ کر پوچھ رہی تھیں۔

"آپ تو ایسے پوچھ رہی ہیں۔ جیسے جانتی نہیں۔" اس نے شاکی نگاہ سے دیکھا۔

"ہاں بیٹا! میں واقعی نہیں جانتی کہ تم نے کس سے شادی کا ارادہ باندھ رکھا ہے۔" صفیہ کے لہجے کا طنز بہت چبھتا ہوا تھا۔ مگر حمیرا کو زیادہ تکلیف اس مصنوعی لاعلمی کے مظاہرے سے ہوئی تھی۔ اس نے سینے پر بازو لپیٹ کر ماں کی آنکھوں میں بغور جھانکا۔

"آپ واقعی بھول رہی ہیں یا میرے منہ سے اگلوانا مقصود ہے۔"

"اپنے منہ سے ہی بتادو۔ جب آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنے کی ہمت آگئی ہے۔ تو یہ بھی کرلو۔" ان کے لہجے سے ناراضی ہویدا تھی۔ "کیا دفتر میں کسی کو پسند کرلیا۔ یا پھر کالج یونیورسٹی کا کوئی۔"

"امی۔ ی ی ی!" وہ سناٹے میں آگئی۔

"کیا آپ واقعی بھول گئیں کہ مجھے کس سے شادی کرنی تھی۔ بلکہ تھی کیوں؟ کرنی ہے عنقریب کرلوں گی۔" اس کے الفاظ کا چناؤ غیر سنجیدہ لگ رہا تھا مگر وہ بے حد سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ صفیہ نے چونک کر دیکھا۔

"کون ہے وہ؟" ان کا سوال بے ساختہ تھا۔ حمیرا کی نگاہیں بھی بے ساختہ ماں پر جم گئیں۔ اور اس پر تب ہی یہ انکشاف ہوا۔ صفیہ قطعاً "بن" نہیں رہی تھیں وہ واقعی لاعلم تھیں اور جان لینے کی عجلت میں بے چین بھی۔

"معید۔" اس کے لب وا ہوئے اور ایک سکون کا احساس بھی ہوا۔ جبکہ صفیہ۔ ان کا چہرہ بے یقینی سے ایسے بگڑا جیسے کوئی رندا پھیر گیا ہو معید۔؟

"ہاں معید۔ آپ تو ایسے ری ایکٹ کررہی ہیں جیسے جانتی نہیں۔ یاد نہیں، تایا ابو نے کیا کہا تھا۔" وہ ماں کو تایا کے الفاظ بتانے لگی۔ مگر صفیہ کچھ نہیں سن رہی تھیں۔ انہیں لگ رہا تھا۔ ٹرین کے ان کے اوپر سے گزر گئی۔

☆ ☆ ☆

بے حد کالی۔ سناٹے والی رات دبے پاؤں گزر رہی تھی، نیند ماں اور بیٹی دونوں کی آنکھوں سے غائب تھی۔

بیٹی ماں کی حالت سے بے پروا بول رہی تھی۔ نجانے کیا کیا۔ ماضی۔ باتیں، وعدے۔ احسان و احساس۔ محبت و عقیدت۔ وہ دھیرے دھیرے ہوش میں آرہی تھیں۔ سارے تقریری عنوانات۔ ایفائے عہد خلوص و مروت۔

بیٹی کو اچنبھا تھا۔ ماں کی یادداشت اتنی کمزور ہوگئی کہ اسے کچھ یاد نہ رہا۔ اور ماں کی بے یقینی حد سے سوا تھی۔ اتنی کم عقل۔ بے وقوف، بلکہ پاگل۔ ہاں پاگل والی مثال درست تھی کہ اس نے پاگلوں والی بات ہی تو کی

تھی۔
کہاں حمیرا عبدالمجید ایک بڑی افسر۔ اعلا تعلیم یافتہ اور کہاں معید اور پھر صفیہ کا منہ کھلا تھا اور زبان چل پڑی تھی۔
منہ کا کھلنا جیسے گٹر کا ڈھکن اٹھایا ہو۔ تعفن۔ سوچ کی تنگی۔ دل کی تنگی۔ دونوں چیزیں مل کر کیسے زندگی کو تنگ کر دیتی ہیں۔
اور زبان کا چلنا۔ اوہو۔ جیسے اناڑی کے ہاتھ تلوار لگ جائے پھر جائے پناہ کہاں۔ حمیرا کو لگا وہ کٹ کٹ کر گرتی ہے۔ تلوار ٹوکے میں بدل گئی۔ اس کے کیئے ٹکڑوں کا قیمہ بننے لگا۔ اور بنانے والی کون اس کی اپنی ماں۔
اسے انکار کا دکھ تھا؟ نہیں۔ اسے ماں کے اظہار یے نے ختم کیا تھا۔ اولاد ماں باپ کو بے عیب سمجھتی ہے۔ اور اس پر ماں کی زبان کے عیب کھلے تھے۔ وہی جیسے گٹر کا ڈھکن کھلا تھا۔
کوئی کسی کے لیے اتنے بُرے الفاظ بھی استعمال کر سکتا ہے۔ اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا۔
وہ بستر سے اٹھ کر باہر برآمدے میں آگئی۔ سرخ اینٹوں والی دیوار پر زرد بلب روشن تھا۔ بلب سے کچھ فاصلے پر مچھر کی تاک میں بیٹھی موٹی چھپکلی۔
دیوار پر ایک بلی چوکنی بیٹھی تھی۔ اور اسے گھور رہی تھی۔ ہاں وہ مخل ہوئی تھی۔ بلی کی نگاہ دیوار کے ساتھ لگے درختوں کے پیچھے بنے چوہے کی بل پر تھی۔ اس نے برآمدے کی جالی سے ناک چپکا دی۔ وہ چھپکلی کی محتاط پیش قدمی کو دیکھ رہی تھی۔ اور بلی کے بے آواز قدموں کو بھی۔
موقع پرست۔ موقع شناس جانور۔ انسان بھی۔ تو کل کو لوگ ہم ماں بیٹی کو بھی اسی نام سے یاد کریں گے۔
سانپ کو دودھ پلاتے رہو۔ پلاتے رہو مگر وہ ڈس لیتا ہے۔
(وہ سمیرا کے پیٹھ میں چھرا گھونپ کر گیا۔ سنپنی کہلاتی نہیں)

پھو پیدا ہوتا ہے ماں کو کھا جاتا ہے۔ تایا ابو نے اس پر جو بر سائی تھی ماں تا جیسی وہ (شفقت ہی تو تھی۔ یعنی وہ بچھو ہو جاتی۔ کبھی نہیں)۔
اس کا سر نفی میں ہلا۔
رات نہیں تھی سیاہ چادر تھی۔
خاموشی نہیں تھی موہن جو داڑو تھا۔ (مردوں کا ٹیلا)
اسے اندھیرے سے ہول آنے لگا۔ اس نے اٹھ کر برآمدے کا بڑا بلب روشن کر دیا۔ مگر یہ کیا؟ دل کو قرار آنے کے بجائے وحشت مزید بڑھی۔
یہ کیسا سناٹا تھا۔ سانس روک دینے والا۔
یہ ہمارا گھر تو نہیں لگ رہا۔ اور یہ رات کب ختم ہوگی کہ آسمان نیلا ہو جائے اور روشنی پھیل جائے اور انسانوں کی آوازوں سے اندر باہر بھر جائے۔ ابھی تو یہ ایک اداسی و حشت سی ہے۔
کیا کہتے ہیں وہ۔ اسے کچھ یاد آنے لگا۔
کہ اداسی بال کھولے سو رہی ہے۔
پتا نہیں۔ اس کا پہلا مصرعہ کیا تھا۔ اور سمیرا نے اسے منع کیا تھا۔ ایسے منحوس شعر پڑھنے کی ضرورت نہیں۔
اور وہ فوراً" مان بھی گئی تھی۔ مگر اس کا پہلا مصرعہ تھا کیا پہلا مصرعہ۔
وہ ذہن پر زور ڈالنے لگی۔ مصرعہ تو یاد نہیں آیا۔ اسے وہ ہنستا مسکراتا وقت یاد آنے لگا جو اس نے گزارا تھا۔
وہ خوب صورت صبحیں 'دوپہریں اور شامیں بے معنی ہنسی۔ بے تحاشا ہنسی۔ فضول باتیں مگر انمول باتیں پر وہ مصرعہ کیا تھا؟
وہ مصرع جو اس وقت اس گھر پر برس رہا تھا۔
یہ گھر جو اس مصرعہ کی عملی تفسیر و تشریح لگ رہا تھا۔
وہ برآمدے سے ہٹ کر کھڑکی میں آگئی۔ تایا ابو کا پورشن کیسی جان لیوا اداسی اور سناٹے میں گھرا ہوا تھا۔
اوہ۔ وہ مصرعہ۔

☼ ☼ ☼

ہمارے گھر کی دیواروں پہ۔ ہمارے گھر کی دیواروں پہ۔ ہمارے۔

حمیرا چھت پر زور زور سے جھاڑو دیتے ہوئے مسلسل ایک ہی مصرعہ دہرا رہی تھی۔

"یہ کیا بریڈ لگا رکھی ہے۔ یقیناً" مجھے کوس رہی ہوگی۔" دھلے کپڑے تار سے اتار کر وہیں کھڑے کھڑے تہہ کر کے رکھتی سمیرا نے پوچھا۔

"بریڈ... کوسنا۔" حمیرا کے ہاتھ رکے۔

"اوہو۔ رکنا نہیں ہے۔ ہاتھ چلاتی رہو۔ چچی جان کے کان جھاڑو کی آواز پر ہی لگے ہوں گے۔

سمیرا اپنے نفیس، ملائم ہلکے رنگوں کے کپڑے ماسی سے نہیں دھلواتی تھی خود ہی ٹب میں سرف ڈال کر بیٹھ جاتی تھی۔ ہلکے ہلکے ہاتھوں سے مسل کر تار پر پھیلاتی جاتی۔ حمیرا کی خراب قسمت۔ چچی نے کپڑوں کا گٹھڑ اٹھا کر اوپر جاتی سمیرا کو دیکھ لیا۔ بری طرح چونکیں۔ انہیں پہلے یہ خیال کیوں نہ آیا۔ حمیرا کو پکارا۔ اور میلے کپڑوں کی باسکٹ سے تمام کپڑے الگ کر کے اسے تھما دیے۔

"آج سے اپنے تمام کپڑے تم خود دھوؤ گی۔

"میں خود۔" حمیرا بمشکل تمام کپڑوں کے ڈھیر کو بازوؤں میں سنبھالے کھڑی تھی۔ حیرت کی زیادتی نے گرفت ڈھیلی کر دی۔ ڈھا۔ سارے کپڑے نیچے۔ صفیہ کو اندازہ تھا۔ فوراً" ڈھیر سمیٹا اور دوبارہ حمیرا کی گود میں زبردستی بھرا دیا۔

"جی ہاں۔ کپڑے دھونا بھی ایک ورزش ہے۔"

"میں ڈنڈ بیٹھک کر لوں گی امی۔ یہ ظلم نہ کریں۔" اس کی تو آواز ہی پھنسنے لگی۔

"وہ بھی کر لینا۔ اچھا خیال ہے مگر پہلے کپڑے۔" صفیہ اپنے ارادوں سے کب باز آتی تھیں۔

"کتنا برا لگے گا نا میں ہل ہل کر کپڑے دھوؤں۔" اس نے بڑی امی کو ہم خیال بنانا چاہا۔ وہ سہلاتے ہوئے مسکرائیں۔ حمیرا کی ہمت بڑھی۔

"یہ تو تمہارے اپنے اوپر ہے بیٹا۔ تم نہ ہلنا۔"

"بڑی امی!" اس کی نگاہیں شکوہ کناں ہو گئیں۔

"سمیرا بھی تو دھوتی ہے ناں۔" صفیہ کے پاس مثالیں بہت ہوتی تھیں۔

"اس کے اور میرے کپڑوں میں فرق ہے۔ وہ ایک بار پہنے کو سرف سے نکالتی ہے جبکہ میرے تو سارے کپڑوں میں برش لگانے پڑتے ہیں۔"

"تو بیٹا جی۔ اتنے میلے نہ کیا کرو ناں۔" صفیہ نے جیسے مسکرا کر دکھایا۔ پھر فوراً" سخت ہوئیں "آج کے بعد اپنے کپڑے تم خود دھوؤ گی۔"

"اور سمیرا! کپڑوں کے بعد چھت کو دھوئے گی بھی حمیرا اور وائپر بھی کرے گی۔"

سمیرا نے جھٹ اثبات میں سر ہلایا۔

"ابھی کیوں آپ کہیں تو چھت اکھیڑ کر نیا لینٹر ڈال دوں۔" وہ کپڑے اٹھائے پیر پٹختی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ بڑی امی زور سے ہنس دیں۔ جبکہ صفیہ نے مسکراہٹ کا گلا گھونٹا۔

واشنگ مشین لگانے سے سمیرا انکاری ہو گئی۔ لان کے کپڑے کون مشین میں دھوتا ہے۔

اور اب چھت کا جھاڑو پوچھا۔ ہوا چل رہی تھی رخ ہی نہیں بیٹھتا تھا۔

"آہستہ۔ گرد مت اڑاؤ کپڑوں پر چپکے گی۔" سمیرا نے ٹوکا۔ پر وہاں تو پھر وہ مصرعہ پر اٹک گئی تھی۔

"ہمارے گھر کی دیواروں پہ"

کون سی اداسی دیکھ لی اللہ نہ کرے۔ جو آج ناصر صاحب یاد آ گئے۔" اس سے پوچھ لیا۔

"ناصر۔ کون۔؟" حمیرا چونکی یعنی الزام تراشی۔ جھاڑو سمیت ہاتھ کمر پر ٹکا کر وہ سچ مچ کی ماسی بھتو لگنے لگی تھی۔

"ناصر کاظمی بہنا۔ مشہور شاعر۔ تم نے اردو کا پیپر کیسے پاس کر لیا؟" سمیرا کی نگاہوں میں شکوک و شبہات تیرنے لگے۔ اس کے ہاتھ سے جھاڑو چھوٹ گئی۔

"یہ ناصر کاظمی کا مصرعہ ہے۔ میں تو سمجھی، مجھے

اچانک مصرعہ ہو گیا ہے۔ میں تو دہرا دہرا کر دوسرا بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ تو یعنی مجھے مصرعہ ہوا نہیں تھا۔ یوں ہی یاد آ گیا تھا۔" اس کا تو جیسے صدمے سے دم نکل جانے والا ہو گیا۔

"جی ہاں۔!" سمیرا نے کھینچ کر کہا۔ "تھوڑی کوشش کرو تو دوسرا بھی موزوں ہو جائے گا۔" اس نے دانت پیسے تھے۔

"تم نے ٹوک دیا۔ دوسرا بھی سمجھو ہو ہی گیا تھا۔" حمیرا نے جھاڑو کی گانٹھ والا چپٹا حصہ ٹھوڑی کے نیچے ٹکایا۔

"اداسی بال کھولے سو رہی ہے۔"

اس کے منہ سے دوسرا مصرعہ بھی ادا ہو گیا۔

"واہ۔"

سمیرا کی بے ساختہ تعریف پر حمیرا کا چہرہ چمک اٹھا۔

"اتفاق سے یہ دوسرے والا بھی ناصر کاظمی کا ہی ہے۔"

"نہیں۔" حمیرا کے ہاتھ سے جھاڑو چھوٹ گئی۔ وہ دھپ سے چارپائی پر بیٹھی پھر زیر لب مکمل شعر دہرایا۔ "ہاں واقعی یہ تو ناصر کاظمی ہی کا شعر تھا۔ تو پھر اسے کیوں اتنا اپنا اپنا سا لگنے لگا؟ کمال ہے۔" اس نے سر پکڑ لیا۔

"نئے ڈرامے کی ضرورت نہیں۔ خدا کے لیے اس جھاڑو کو بنٹا لو۔ مختصر سی چھت صاف کرنی تھی۔ قذافی اسٹیڈیم کا ٹھیکہ نہیں دیا گیا تم کو جو۔"

"جو میری امی کا حال ہے ناں۔ وہ ٹھیکہ بھی لے دیں گی۔ اور مائیں بچوں کی صحت مندی پر نظر کا ٹیکا لگاتی ہیں اور میری ماں۔ آہ۔"

سمیرا نے حمیرا کو بغور دیکھا۔ وہ کسی بھی زاویے سے موٹی نہیں تھی۔ پتا نہیں، چچی کیا چاہتی تھیں۔ تربیت کرنا اور بات ہے۔ حمیرا کی لاپروائی اور بے ڈھنگے پن کی اصلاح کا بیڑا بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ مگر یوں ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جانا۔ اس کی نظریں بے حد آزردہ (مصنوعی آزردگی) نظر آتی حمیرا پر جم گئیں۔ تسلی کے دو لفظ تو بنتے تھے۔ مگر منہ کھلنے سے پہلے کان کھل گئے۔ سارا دھیان پلٹ گیا۔ اس کے قدم کسی سحر میں جکڑے گئے۔ آواز کے تعاقب میں اٹھا ہی چاہتے تھے۔ مگر حمیرا نے بازو پکڑ کر روک لیا۔

"اب جاتی کدھر ہو۔ جب مجھ جیسی تخلیقی صلاحیتیں رکھنے والی لڑکی سے جھاڑو پوچھا کروایا جائے گا تو یہی حال ہو گا۔" اسے اپنا غم پڑ گیا۔ چارپائی پر ڈھے گئی۔ آنکھیں موند لیں۔ لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے آہ۔

سمیرا نے اسے اس کے حال پر چھوڑا اور دبے قدموں سے سرسری انداز اپنائے چھت کی چھوٹی دیوار تک چلی آئی۔ اس کی سماعتوں نے دھوکا نہیں دیا تھا۔ وہ ستون کی آڑ میں ہو گئی۔ وہی تھا۔ بائیک اسٹارٹ کیے اپنی ماں کی بات بغور سن رہا تھا۔

دل یک دم خوشی سے بھر گیا۔ تین دن پہلے دیکھا تھا۔ جب وہ کالج جا رہا تھا اور یہ اسکول وین میں بیٹھی تھی۔ راستے ایک ہو گئے تھے۔ مگر یوں اس طرح چھپ کے دیکھنے کا بھی ایک الگ لطف ہے۔ مگر کیا ہوا۔ سگنل بند ہو گیا وہ بائیک پر تھا زن سے نکل گیا۔

"کہتے ہیں نگاہ کا ارتکاز شیشے کو توڑ دیتا ہے۔ اسے کیوں نہیں پتا چلتا تھا۔ میں اسے دیکھ رہی ہوں۔ یا وہ پتھر ہے۔ نہیں خیر پتھر تو نہیں ہے۔ اسے اپنی الزام تراشی پر خود ہی افسوس ہونے لگا۔

ماں کی بات ختم ہوئی اور وہ زن سے بائیک اسٹارٹ کر کے یہ جا۔ اور۔ وہ گلی سے بھی نکل گیا۔

ساری خوشگوار ہت ہوا ہو گئی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ امی مجھ سے کروانا کیا چاہتی ہیں۔" حمیرا کی دہائی پر وہ چونکی۔

"آں۔ کیا کہا تم نے؟"

"نہیں! تم ہو کہاں؟ میں نے ساری رات زلیخا کی اور تم کہتی ہو، مرد تھی کہ عورت۔"

حمیرا کا ہاتھ اپنے گال پر پڑا۔ سمیرا نے سر جھٹک کر خود کو حاضر کیا۔

"ہاں تو کون تھی زلیخا۔ مرد یا عورت؟"

"نہیں!" حمیرا کا گال پر ٹکا ہاتھ منہ پر جا پڑا۔ پھر اسے

ہاں بابا غفار کی چھجے والی دکان اور حسب معمول چبوترے پر بیٹھا بابا اور جو اس کی حرکتیں تھیں تو وہ۔" حمیرا نے سکھ کا سانس لیا۔

وہ حرکتیں یقیناً "ایسی تھیں جو کسی بھی انسان کا موڈ تباہ کر سکتی تھیں اور پھر سامنے سمیرا جیسی نفیس طبع' نازک اندام' نازک مزاج لڑکی ہو تو۔

اسے شرارت سوجھی۔ ادھر ادھر دیکھا جیسے کچھ کھوج رہی ہو۔ پھر یک دم آنکھیں چمکیں۔ چوٹی سے ربر بینڈ نکالا۔ زمین پر بیر کی گٹھلی پڑی تھی' ربر بینڈ کو دو انگلیوں میں پھنسا کر گٹھلی بیچ میں پھنسائی۔

ذرا سا سر نکال کر بابا کو دیکھا۔ گڈ۔

نشانہ باندھا اور ہاتھ ڈھیلا چھوڑ کر جھٹ نیچے ہو گئی۔ تین' دو' ایک۔ ہاہ۔ یہ بابا کی آواز کو کیا ہوا۔ یہ تو کسی موٹر سائیکل کی عجیب سی آواز تھی۔ اس نے ذرا سا سر اٹھایا۔

"ہائے میرے اللہ یہ تو بھائی ریاض تھے' پھپھی بھولی کے اکلوتے لخت جگر اور کوئی لمحہ جاتا تھا جب پھپھی بھولی میدان میں آجاتیں ان کا بیٹا کسی اندھی گولی۔ اونہوں کسی گٹھلی کا نشانہ بن گیا تھا۔

نرا سیاپا گھر بیٹھے مصیبت۔ اللہ میاں جی۔ وہ رکوع کی حالت میں نیچے کی جانب بھاگی تھی۔

☼ ☼ ☼

نیچے پہنچ کر وہ زیادہ تیزی سے بھاگتی اندر آئی۔

یہ کیسی آواز تھی۔ شور سا۔ اوہ یہ تو پھپھی بھولی کی آواز ہے۔ وہ چپکے سے کھڑکی تک چلی آئی پردہ ہٹا کر دیکھا منظر حسب توقع تھا۔ جمگھٹا لگ چکا تھا۔

"یہ تو پھپھی بھولی کی آواز ہے۔ ہے نا۔" سمیرا چونکی۔

"ہاں ان ہی کی لگتی ہے" اس نے تجاہل برتا۔

"لگتا ہے کوئی بڑا جھگڑا ہو گیا ہے۔" سمیرا کھڑکی کی جانب بڑھ رہی تھی۔

"ارے یہ تو رے۔ آز ہیں اور یہ ان کے منہ کو کیا ہوا؟ لگتا ہے کوئی بڑا زخم آگیا ہے۔ اوہ اللہ۔"

تپ چڑھ گئی۔ وہ اس سے اپنی امی کے مظالم سے بچنے کے لیے مشورے مانگ رہی تھی اور اسے ہوش تک نہ تھا۔

"زلیخا نے کون ہونا ہے۔ بڑی نیک بچی تھی۔ پیدا ہونے سے پہلے اس کی ماں مر گئی۔ اور پیدا ہونے کے بعد وہ خود بھی مر گئی۔" دو لفظی کہانی۔ اس نے ہونٹ پھیلائے۔ جیسے ہنسی ہو۔

"کیا بکواس کر رہی ہو۔ پیدا ہونے سے پہلے ماں کیسے مر سکتی ہے۔"

"صرف ماں کیوں۔ اس کی نانی کا بھی بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔"

"رہنے دو۔ تم سے تو بات کرنا فضول ہے۔ جا رہی ہوں میں نیچے۔" منٹ بھر میں وہ سارے زمانے سے خفا لگی۔ ادھر حمیرا جو زلیخا کے قصے کو طول دے کر اگلی سات نسلوں تک لے جانے والی تھی۔ سخت بد مزہ ہوئی اور پھر حیران بھی۔

"یہ بیٹھے بٹھائے موڈ کیوں خراب ہو گیا؟" اس نے سمیرا کو بغور دیکھا۔ وہ ڈھیلے ہو جانے والے بالوں کو کلپ میں جکڑتے ہوئے باقاعدہ پھولا غبارہ لگنے لگی تھی اور پھر اسی ناراض تاثر کے ساتھ نیچے جانے لگی۔

"ارے! یہ سوکھے کپڑوں کا ڈھیر بھی تو لیتی جاؤ۔"

"تم لے آنا۔"

"پر میں تو صفائی کر رہی ہوں۔"

"تو یہیں رہنے دینا۔"

"نہیں ابھی تو ٹھیک ٹھاک تھی۔" حمیرا نے چاروں جانب دیکھا۔ "تو موڈ آف کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟" وہ منڈیر تک چلی آئی۔

وہی صدیوں پرانی گلی۔ سامنے والوں کی کھڑکی کا دو سال سے ٹوٹا شیشہ۔ پڑوسیوں کے پرانے آم کے درخت پر چڑیوں کا آنا جانا۔

ان کے ساتھ والے گھر کی ٹنکی حسب معمول ٹپک رہی تھی' دیوار پر لکیر کی صورت سبز کائی کا نشان۔

سب کچھ تو جوں کا توں ہے پھر اس اچانک بد مزاجی و جھنجلاہٹ کی وجہ۔

سمیرا کے تو پیروں میں بجلی دوڑ گئی۔ جھٹ پٹ دوپٹا شانے پر ٹکایا۔ بھاگنے ہی والی تھی۔ حمیرا نے فوراً روکا۔

"ارے رکو کہاں جارہی ہو۔ گلی میں اتنا رش ہے۔ تایا ابو غصہ کریں گے الٹے ہمیں۔ ہمیں میں ہمارا کیا کام۔ شام۔ شام۔ کو چلیں گے۔ پھپھی بھولی کے گھر جاکر حال پوچھیں گے۔ یوں بھی ہم تو رشتے دار ہیں۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔" سمیرا کو آئیڈیا دل سے بھایا۔ دوبارہ کھڑکی کے ساتھ جاکر چپک گئی۔ رش بہت زیادہ تھا۔ نگران کا گھر اونچا تھا سب صاف نظر آرہا تھا۔

پھپھی بھولی دونوں ہاتھ اٹھا اٹھا کر بددعائیں دے رہی تھیں۔ بددعائیں اردو پنجابی کا مکسچر تھیں، مگر بددعاؤں کا اصل تاثر صوتی تھا پھپھی بھولی کا دبنگ جلالی لہجہ۔

"اس کے ہاتھ ٹوٹیں۔"

"اسے سرسام ہو۔"

"نہیں۔۔۔ اللہ میاں جی!" حمیرا نے سر پکڑا۔

"اسے خارش لگے کھانے پینے سے رہ جائے جس نے میرے بچے کو مارا۔"

"بچہ!" حمیرا نے ذرا سی گردن اٹھا کر دیکھا۔ سیاہ پینٹ، سفید شرٹ میرون وسیاہ امتزاج کی ٹائی اور پھپھی بھولی اپنے دوپٹے سے بیٹے کا چہرہ پونچھ رہی تھیں۔ یہ بچہ تھا اونچے پورے قد کا بھائی ریاض۔ پروفیسر ریاض۔ ہنہ۔

"ہاں بھئی۔ بابے غفار تو بتا۔ میرے پتر سے کس نے دشمنی نکالی۔ تو ہی سارا دن لوگوں کے دروازے تاڑتا ہے۔ کیا فیدا تیری اس نگرانی کا۔ تجھے نہ پتا چلا۔ کس نے میرے بیٹے کے آنے جانے کے ٹیم کی خبر رکھی۔ ہائے دشمنوں کے کلیجے سڑتے تھے میرا پروفیسر صاحب۔" پھپھی نے سینے پر دوہتھڑ مارے۔

"بات یہ ہے پھپھی بھولی۔" بابا غفار اتنی عزت افزائی پر آگے آیا۔

"پھپھی۔ بھولی! ناں میں کس رشتے سے تیرے پھپھی ہوگئی؟" پھپھی بھولی نے فوراً آستینیں اوپر کیں۔ "مجھے تو چھوڑو میری ماں کے جمنے کی مٹھائی سب سے پہلے تو نے ہی ڈکاری ہوگی اور آج میں پھپھی ہوگئی۔"

بابا غفار پھس ہوگیا سارا مجمع ہنس پڑا تھا۔

"او بھولی عمروں میں کیا رکھا ہے۔"

"او چل رہن دے۔" پھپھی نے ہاتھ نچایا۔ "میں ہی پاگل ہوں جو تجھ سے پوچھ بیٹھی۔ تو نے ساری حیاتی بڈیوں کو تاڑنے کے علاوہ کیا کیا ہے۔"

پھپھی بھولی نے بیٹے کا ٹائی سے ماتھے کا پسینا پونچھتے ہوئے۔ جو تکلیف سے نہیں ابھرا تھا یہ عرق ندامت تھا۔ مجمع میں کئی پروفیسر صاحب کے شاگرد بھی تھے۔

"بھولی تو حد سے گزرنے لگی ہے۔" بابا غفار نے توند سے سرک جانے والی دھوتی اوپر چڑھائی (گویا لڑنے کی تیاری کی)

پروفیسر ریاض نے سٹپٹا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کتنی شرمندگی ہو رہی تھی پر اب ماں کو کیسے روکے۔ اماں بھولی پیاری والدہ ماجدہ۔ تو ترکھان کے دھاگے کا گولا تھیں ایک بار ہاتھ سے چھوٹ گیا تو کھلتا چلا گیا۔ دور تک پہنچ گیا اسی طرح صلواتیں سناتی اماں بھولی اب دور تک جانے والی تھیں بات تو تو میں میں سے بڑھ کر باپ دادے تک جانی تھی گڑے مردے اکھڑ جانے تھے۔

ماں کو کیسے روکے پر۔ اوہ۔ بھٹکتی نظریں سامنے والی کھڑکی پر آن رکیں آگے سمیرا کا چہرہ۔

جو کہتا تھا۔ وقت تھم جائے دنیا بولتی رہے۔ بھلے سے جھگڑتی رہے۔ مر بھی جائے۔

مگراف۔ پروفیسر ریاض نے نگاہیں پھیرلیں۔ ایک دنیا اسے دیکھ رہی تھی کوئی جو اس کے دیکھے کو دیکھ لیتا۔ ناں نہیں۔ بری بات۔

سمیرا کو بھی اسی چیز کا احساس ہوا۔ دوسرے پھپھی بھولی کی آواز ان کے کوسنے اب دل دہلانے والے ہوگئے تھے۔ حمیرا کپکپانے لگی۔ کھڑکی بند کردینی چاہیے نہ آواز آئے گی نہ دل دہلے گا، مگر یہ سمیرا۔ یہ زیر لب کیا کہہ رہی تھی۔ حمیرا نے کان لگائے۔

اگلے ہی منٹ وہ ڈھے گئی۔ پھپھی بھولی کی ہر بددعا پر وہ بڑے خشوع و خضوع سے آمین ثم آمین کہہ رہی تھی۔ حمیرا نے تیزی سے اٹھ کر سمیرا کا شانہ دبوچا۔

"کیا بول رہی ہو تم؟" حمیرا نے اس کی بڑبڑاہٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"اوہ۔ پھپھی کی بددعاؤں پر آمین کہہ رہی ہوں اور کیا کہوں گی۔"

"تم آمین کہہ رہی ہو۔" حمیرا کی آواز پھٹ سی گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سمیرا کے شانے تھام کر دبوچ لیے۔ ساتھ میں زور زور کے جھٹکے بھی دیے۔

"تمہارا کلیجہ نہ کانپا سمیرا۔ میرے مرجانے کی بددعاؤں پر آمین کہتے ہوئے۔"

"تمہارے مرجانے کی بددعائیں؟" سمیرا نے دہرایا۔ یہ حمیرا کو کیا ہو گیا تھا۔ وہ تو اس بندے کو کوس رہی تھی جس بدبخت نے۔۔۔

باہر سے پھپھی بھولی کا نیا کوسنا جاری ہوا۔

"نہ صرف ہاتھ ٹوٹیں اس بدبخت کے بلکہ دونوں ٹانگیں بھی کسی گڈی کے نیچے آکر کٹ جائیں اور ساتھ ہی کمر میں کب نکلے اور۔۔۔"

سمیرا کے منہ سے پھر آمین نکل گیا۔ حمیرا نے جھٹکا دے کر اسے بیڈ پر پٹخا اور اپنے دونوں ہاتھ لمبے کر کے دکھائے۔

"تمہیں ذرا دکھ نہیں ہوگا جب میرے ہاتھ ٹٹ جائیں گے یعنی میں حمیرا ٹنڈی۔" "اور میں۔" اس نے جیسے جھری جھری لی۔ "میں حمیرا کبڑی۔ ہائے میرے مولا۔" ساتھ ہی اسے غش آگیا۔ سمیرا کے دائیں جانب لڑھک گئی۔

"تت۔۔۔ تت۔۔۔ تم نے۔۔۔ یعنی کہ تم نے ریاض کو مارا۔۔۔ حمیرا۔" وہ حلق کے بل چلائی تھی۔ حمیرا کے دیوتا کوچ کر گئے یعنی خود۔ بقلم خود اپنے منہ سے اعتراف جرم۔

اس نے اپنا سیدھا ہاتھ ہونٹوں پر رکھا۔ پھر الٹا ہاتھ۔ مگر کیا فائدہ۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا؟" سمیرا نے اس کا بازو دبوچ کر کمر کے پیچھے کر کے موڑا۔

"بابے ریاض۔ آئی۔ میرا مطلب ہے پروفیسر غفار۔ آئی آئی آئی۔" ہر غلط لفظ پر پشت پر کھڑی سمیرا بس ہاتھ کا دباؤ ہی تو بڑھا رہی تھی۔

"میرا مطلب ہے۔" حمیرا کے پسینے چھوٹے "بابے غفار کو مار رہی تھی۔ اللہ جانے کہاں سے بھائی رے۔۔۔ یا۔۔۔ ز آگئے۔ ہائے۔" جملہ مکمل ہوا۔

سمیرا نے دانت پیسے تھے اور ساتھ ہی جھٹکا دے کر ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

"مگر آنکھ پر لگ جاتا تو۔"

"لگا تو نہیں نا۔" حمیرا اپنا بازو سہلا رہی تھی۔

سمیرا نے باہر جھانکا۔ مجمع چھٹ گیا تھا۔ بیٹا ماں کو سہارا دیے لے جا رہا تھا اتنا بول بول کر وہ تھک چکی ہوں گی نا۔

کون سے کمبخت شاعر اور لکھاری کہتے ہیں۔ نظروں میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ پشت پر بھی محسوس ہو جاتی ہیں اب کوئی اس ریاض کو دیکھتا۔

اس کا دل بجھ سا گیا اور یہ دل بھی کبھی ضدی بچہ ہو جاتا ہے۔ نافرمان سا۔ کان پکڑوا دو۔ اٹھک بیٹھک کروا لو یا بھلے سے مرغا بنا دو پر ہٹ جاتی نہیں۔

یا پھر میں زیادہ مجبور ہوں۔ میرا خود کا دل میرے مدمقابل ڈٹ جاتا ہے۔

اور ریاض اپنا آپ کتنی مشکل سے ظاہر کرتا ہے یا وہ محتاط اور بردبار ہے لغزشوں سے ڈرتا ہے یا دنیا سے یا پھر؟

اس نے خود سے سوال کیا تھا اگر حمیرا سے پوچھتی تو وہ صاف کہتی اپنی ماں سے۔"

✡ ✡ ✡

حمیرا بالکل بھی نہیں جانا چاہتی تھی اور سمیرا اکیلے جا نہیں سکتی تھی بڑی امی اسے کبھی بھی نہ اجازت دیتیں۔ سمیرا کا بس چلتا تو وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جانے کے لیے لباس و انداز بدل لیتی وہ بلا

کی جامہ زیب تھی۔
جبکہ حمیرا بھاڑ سا منہ کھولے اسے تیار ہوتا دیکھ رہی تھی۔ تیار ہونا اور مزید چار چاند ٹانکنا سمیرا کی فطرت تھی جبکہ وہ حمیرا... صفیہ کبھی سلیقے کی چوٹی باندھ بھی دیتیں تو بی بی حمیرا جھٹک جھٹک کر ڈھیلی کرلیتی۔ دو چار لٹیں ماتھے سے نکال کروائیں بائیں گرالیتی۔
"امی تو میرے بال یوں کس دیتی ہیں کہ پہلی نظر میں گنجی دکھائی دیتی ہوں۔" یہ کسا منہ جیسے جیسے موڑا گھٹنا۔ جیسے پانی میں پڑا دہی بڑے کا بڑا۔ گول اور پھولا پھولا سا۔
سو جب دونوں گھر سے نکلیں۔ فرق واضح تھا۔
سمیرا نے آسمانی اور انگوری رنگ کا نفیس سالان کا جوڑا پہن رکھا تھا۔ براؤن دوپٹہ۔ اس وقت ناخن نیل پالش سے پاک تھے، مگر پھر بھی بہار دکھا رہے تھے صاف ستھرے، ترشے گلابی گلابی سے۔
حمیرا نے دل سے تعریف کی اور خود تایا ابو کی گیارہ نمبر سوفٹی پیروں میں پھنسا کر چڑک چڑک کی آواز کے ساتھ سمیرا کے پیچھے لپکی۔
بڑی امی باخبر تو ہو چکی تھیں۔ پروفیسر اے ڈی ریاض کو کسی نے پتھر مارا تھا پھپھی بھولی چھچھاڑ ڈالیں اور رہا نہ لگے... یہ ممکن نہیں۔ صفیہ عصر کی نماز کے بعد جائے نماز پر خاموش بیٹھی تھیں حمیرا نے سمیرا کو اشارہ کیا کہ وہ صفیہ کو جا کر بتا دے۔
"ہاں میں کہہ دیتی ہوں۔ تم امی کو بتا آؤ۔" حمیرا تیزی سے بڑی امی کے کمرے کی جانب آئی، وہ سونف صاف کررہی تھیں۔
"ہم پھپھی کے گھر جا رہے ہیں۔ بھائی ریاض سے کچھ پوچھنا ہے۔"
ذرا سا منہ نکال کر اطلاع دی اور دروازہ جھپاک سے بند کر دیا۔
بڑی امی کا کھلا منہ۔ بند ہو گیا اب کیا پکارتیں۔
دوسری طرف صفیہ کی نگاہیں سمیرا پر اٹھیں تو اٹھی رہ گئیں۔

حسن پر سجاوٹ و بناوٹ کا تڑکہ اللہ اللہ... کیا ذوق پایا تھا اس نے۔ دو روپے گز کا کپڑا بھی تن پر سج کر انمول ہو جاتا۔ نرم ہاتھ پیر۔
اور خود ان کی صاحب زادی۔ اسے کہاں توفیق ہوئی ہوگی کپڑے بدلنے کی وہی کل صبح کا پہنا ہوا پرنٹڈ گہرے رنگ کا سوٹ جو پسندیدہ تھا۔
"جی اس پر لگے داغ دھبے نظر نہیں آتے۔"
اور جوتے کی چڑک چڑک کی آواز۔ صفیہ کو لگا، دانتوں میں ریت آرہی ہو۔ دل تو چاہا آواز دیں، مگر اس فضیحت خانم پر اثر ہوتا تھا بھلا۔
صفیہ نے سر کے خفیف اشارے سے منتظر کھڑی سمیرا کو گویا اجازت دی اور منہ پھیر لیا، سمیرا ادھر سے پلٹ گئی۔
"حسن بھی ناقابل برداشت ہو سکتا ہے؟" اندر سے اٹھنے والے سوال نے صفیہ کو چونکا دیا، وہ سوچ میں پڑ گئیں۔
اوں... وں... وں... مشکل سوال تھا اور "اندر" سے اٹھا تھا۔ خود کو انسان کیسے ٹالے؟
"ہاں۔ حسن بھی ناقابل برداشت ہوتا ہے۔" جواب آیا۔
اگر دوسروں کی ملکیت ہو اور ہم تنگ نظر اور تنگ دل ہوں)
ادھر دروازے پر کھڑی حمیرا... سمیرا خوش تھیں۔ کیسے اپنی اپنی ماؤں کی نظروں میں آئے بغیر نکل آئی تھیں۔
یہ مائیں بھی نا۔
ایک کو سنگھار پر تشویش ہوئی تھی اتنی تیاریاں۔
اور دوسری نے
اتنی گندی بیٹی کی ماں ہونے پر یا تو بیٹی کو مارو تا تھا یا خود کو۔
چلو جانے دو۔ بچت ہو گئی۔

✡ ✡ ✡

پھپھی بھولی کے گھر کا منظر ویسا ہی تھا جیسا سمیرا، حمیرا

بچپن سے دیکھ رہی تھیں۔ بعض دفعہ تو گمان ہوتا۔ یہ کوئی تصویر ہے۔ بس یہ کہ پہلے پھپھی جوان ہوتی تھیں اور اب بڑھی۔ کالے بال سفید ہو چکے تھے۔

مگر سب کچھ جوں کا توں تھا۔ صاف ستھرا اپنی جگہ پر۔

بائیں جانب امرود کا پیڑ تھا۔ نیچے کچھ پھولوں والے پودے کیاری میں لگے تھے۔ باقی سارا دھنیا پودینا تھا اور ہرا لہسن۔ سارا سال یہ ننھی سی فصل ہری بھری ہی رہتی کبھی کبھی ہری پیاز بھی ہوتی تھی۔ سرخ فرش چمک رہا تھا۔ پوچا لگا کر کھردری اینٹوں میں بھی چمک آچکی تھی۔

آنگن کے بیچ و بیچ دو چارپائیاں ہمیشہ سے پڑی رہتی تھیں۔ چارپائیوں کے پیچھے برآمدہ تھا۔ برآمدے کے پیچھے لائن سے تین کمرے بنے تھے جن کے دروازوں کھڑکیوں پر جالیاں لگی تھیں۔ ایک لوہے کی جالی چوروں سے محفوظ رہنے کے لیے 'دوسری پلاسٹک کی چھلنی والی مچھروں سے محفوظ رہنے کے لیے۔

برآمدے کی ایک ننگی چارپائی پر دھلے برتن اور چاندی سی منجھی پتیلیاں اوندھی پڑی رہتی تھیں اوپر جالی کا کپڑا۔

دیوار گیر الماریوں میں سجے ہوئے سالوں پرانے ڈیکوریشن پیسز پتا نہیں ڈیکوریشن پیس کہلائے جانے کے قابل بھی تھے یا نہیں۔ کم از کم سو سال پرانی خاندانی سرمہ دانی۔ بالشت بھر کے فاصلے پر پلاسٹک کا اسٹینڈ والا گول شیشہ اس سے بالشت بھر آگے اے ڈی ریاض کے ابو کی وہی تصویر بڑی کروا کے لگا رکھی تھی جو ان کے شناختی کارڈ پر لگی تھی۔ (ان کا شناختی کارڈ بھی لوہے کی الماری پر اوپر کر کے چسپاں تھا)

دوسرے خانے میں تبت اسنو کی سفید شیشی۔ ساتھ میں بلیک کیٹ پاؤڈر اور دو خالی بوتل پرفیوم کی بھی رکھی تھیں۔ پھپھی بھولی کے ہاتھ سے بنی اونی ٹوکری میں کنگھیاں نیل کٹر جیسی چیزیں رکھی تھیں۔

باقی سارے خانوں میں پہلے تب پھپھی بھولی کے ہاتھوں کی بنی چیزیں سجائی جاتی تھیں پھر ان کی چاروں بیٹیوں کا سلیقہ وہ ہنر بھی دکھائی دینے لگا۔

لونی بلی۔ کپڑے کے گڈے گڑیا۔ موتیوں کے گل دان اور نجانے کیا کیا۔

دھلے دھلائے پردے۔ کارنس پر کڑھے ہوئے سفید پردے۔ ایک تصویر سا سجا ہوا گھر۔ بڑی امی کو اس ساکت سے منظر سے وحشت ہوتی تھی۔

"بھولی نے ساری زندگی صحن کی چارپائی پر گزار دی۔ گھر بکھرتے ہیں سمٹتے ہیں اس میں خوب صورتی ہے 'زندگی ہے۔ گھر اور روڈ میں فرق ہونا چاہیے۔ یہ آنے کا راستہ 'یہ جانے کا' رک جاؤ چل پڑو۔

ذرا چوکے سارجنٹ پکڑ لے گا کوئی سارجنٹ تو بند مٹھی میں نوٹ کی کڑکڑاہٹ محسوس کر کے چھوڑ بھی دیتا ہے۔ بھولی پر یہ بھی نہیں چلتا۔ آگے بیٹیاں بھی ماں کا پرتو۔ بس وہ اللہ دتا ریاض ہے جو۔"

"اے ڈی ریاض امی۔" سمیرا اگر پاس ہوتی تو تصحیح ضروری سمجھتی۔

"ہاں ہاں۔ اے بی سی ڈی۔ جو بھی۔ اسے ذرا سی گنجائش سے نوازا گیا ہے۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ پڑھا لکھا ہے یا پھر یہ کہ اکلوتا ہے۔ بلکہ چھوڑو۔ اپنے پیسوں سے کرتا ہے تب بھولی نہیں بول پاتی ہنہ۔"

واقعی اے ڈی ریاض کا کمرہ اس باقی گھر سے قطعاً میل نہیں کھاتا تھا۔ دو سال پہلے تک یہ ایک فضول سا اسٹور نما کمرہ تھا جسے ریاض نے گرا کر دوبارہ اونچی چھت اور زیادہ جگہ گھیر کر تعمیر کروایا۔ کمرے کے بالکل درمیان میں گولائی کٹ دے کر کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ڈرائنگ روم محسوس ہوتا اور گولائی کے اس طرف بیڈ روم ایک جانب اسٹڈی ٹیبل اور دیوار گیر شیشے کی الماریاں بنا کر دنیا جہان کی کتابیں بھی سجا دیں۔ دیوار پر تمغے اور انعامات لیتے وقت کی تصاویر۔

پھپھی بھولی نے تو فوراً "سفید کپڑا" فریم میں چڑھا دیا۔ نئے کمرے کے کارنسوں کے لیے پردے اور خصوصاً "کمپیوٹر کے لیے کڑھائی والا کور۔

اے ڈی ریاض نے ماں کو کیسے سمجھایا۔ یہ الگ

داستان تھی۔ بات بڑی مشکل سے صوفے کے کشن پر آکر رکی۔

"باقی آپ کچھ نہ کریں۔ مجھے ایسے ہی کمرہ چاہیے۔"

اس نے نیا خوب صورت فرنیچر بھی خریدا۔ ایک دروازہ گھر سے باہر گلی میں نکالا تاکہ دوستوں خصوصاً شاگردوں کو آنے جانے میں آسانی رہے۔

شروع کے چند دن تو پھپھی بھولی نے برداشت کیا۔ خیر ہے نیا کمرہ ڈالا ہے دوست وغیرہ دیکھنے آئیں گے ہی مگر جب شام کے بعد سے یہ روٹین دیکھا اور پتا لگا کہ یہ شاگرد ٹیوشن لیں گے ان سفید صوفوں پر بیٹھ کر۔ اس کا دم حلق میں اٹک گیا۔ آنکھیں گویا ابل پڑیں اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

نیا نکور کمرہ۔ اور اس پر زمانے بھر کے گندے مندے لڑکے وہ بھی روزانہ۔

"میں کہتی ہوں پروفیسر اے ڈی ریاض۔ تعلیم ہی دینی ہے نا تو ادھر ویڑے میں پلاسکٹ (پلاسٹک) کی کرسیوں پر بٹھالے۔ یہ کیا کمرے میں گھسالیا؟"

"اماں جی! وہ دوسری تیسری کے بچے نہیں ہیں۔ یونیورسٹی کے طالب علم ہیں بلکہ ان میں سے بعض تو خود بھی یونیورسٹی ٹیچرز ہیں اور ایم فل پی ایچ ڈی وغیرہ کی ڈسکشنز کے لیے آتے ہیں میں نے اسی وجہ سے تو یہ کمرہ بنوایا ہے۔ کچھ بے چارے تو دوسرے شہروں سے بھی آجاتے ہیں وہ ٹھہر بھی سکیں۔"

"دیکھیا؟" پھپھی بھولی بھونچکی رہ گئی۔ "میں نے تو سوچا تو نے اب کمرہ بنوالیا ہے تو تیری شادی کا بھی سوچوں اور تو نے اتنے پیسے ان ہڈ حراموں کے آرام کے لیے لگادیے۔"

اے ڈی ریاض مسکرا دیا۔ اماں بھولی نے ریاض سے چھوٹی چار بہنوں میں سے دو کو بیاہ دیا تھا اور دنیا جانتی تھی۔ پیچھے والی دو کو بھی بیاہے بغیر وہ ریاض کو سہرے کی دکان کے پاس سے بھی گزرنے نہیں دے گی۔

کمرہ تیار دیکھ لیا تو ہوشیاری۔

مگر کمرے کا مقصد ہی اور تھا۔ اے ڈی ریاض انگلش کا پروفیسر تھا۔ بے حد قابل' گولڈ میڈلسٹ انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کے بعد اس نے دو تین ماسٹرز اور بھی کرلیے تھے۔

ایم اے پولیٹیکل سائنس۔ تاریخ مشرق اور مغرب میں بھی دسترس حاصل کرلی۔ (وہ بھی انگلش کے ساتھ) تھوڑی قومی حمیت جاگی تو ایک ایم اے اردو میں بھی پھڑکا دیا۔

مگر قسمت۔ سارے ایم اے شیم اے۔ اماں بھولی کے آگے پانی بھرتے تھے۔ اماں بھولی کے اپنے نظریات تھے۔ اکلوتے بیٹے کو اس نے بہت خوشی خوشی اسکول داخل کروایا تھا۔ مسجد بھی خود چھوڑ کر آتی تھی۔ اللہ دتا حافظ قرآن ہوجائے۔

اللہ دتا ذہین تھا۔ اس نے بہت جلد قرآن مجید پڑھ لیا بہت سی سورتیں یاد کرلیں' مگر اس کی ذہانت کورس کی کتابوں سے زیادہ چھلکتی تھی۔

اسکول ماسٹر تعریف کرتے۔ اماں بھولی خوش ہوجاتی۔ قرآن حفظ کروانے کے حوالے سے اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی حافظ قرآن کے والدین کے لیے جنت پکی ہوتی ہے۔

اب اسکول میں لائق بچے سے ماں باپ کو کیا فائدہ۔ اتنے چھوٹے بچے کو گھر میں بھی نہیں بٹھا سکتی تھی۔ مسجد کون سا سارا دن لگتی تھی تو بہتر ہے وہ بچپن کے کچھ سال اسکول میں گزار لے پھر باپ سے ہنر سیکھ لے' مگر باپ سے ہنر سیکھنے کا مرحلہ ہی نہ آیا۔ اماں بھولی بیوہ ہوگئی۔

اے ڈی ریاض کا باپ ریاض جو کہ اصل ریاض تھا' اپنی تھوڑی سی زمین پر کھیتی باڑی کرتا تھا' اچھا گزارا ہورہا تھا' مگر جب ہل چلانے والے ہاتھ نہ رہیں تو زمین بانجھ ہوجاتی ہے۔

اماں بھولی جی دار تھی' مگر چھوٹی سوئی سے پھول ٹانکے بنانے والی کے ہاتھوں میں پھاوڑا کیسے سماتا۔ یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ پریشان حال نے بیٹے کو دیکھا۔ وہ ہے نا اس کا اکلوتا سپوت۔ جسے اس نے

بڑی مرادوں سے مانگا اور منتوں سے پالا۔ وہ بسائے گا اپنی زمین' مگر یہ کیا اماں بھولی کے سر پر جیسے کسی نے ڈنڈا مارا۔ قلم تھامنے والے ہاتھ۔ ہل چلانے کے اہل تھے ہی نہیں۔ اللہ دتا ریاض زمین کھودنے کے لیے پیدا نہیں ہوا تھا۔

"ہائے۔" اماں بھولی کا بس چلتا تو سر میں مٹی ڈال کر گلی گلی چکراتی۔

"ہائے! مجھے کیا پتا تھا۔ اسکول والے میرے پتر کو نامرد ہی کردیں گے۔ ہائے کسان کا پتر ہو کر اسے گوڈی کرنی بھی نہیں آتی۔ ہائے ماسٹر تیرا بیڑہ غرق ہوجائے' میرے پتر کو برباد کردیا۔ ہائے میں بیوہ تو اپنی روٹی پانی کرلوں گی۔ ہاتھ میں ہنر ہے' سارے کے سارے ٹانکے آتے ہیں پراندے بنالیتی ہوں چنگیریں چھابیاں تک بنانی آتی ہیں' میرے بے ہنرے پتر کا کیا ہوگا۔ ہائے۔"

"بہت قابل اور ذہین بچہ ہے۔ تھوڑا صبر کرو۔ خام سونا ہے' بھٹی میں تپے گا تو ڈھلے گا۔ شکل نکل آئے گی۔"

"میرے سامنے پڑھوں لکھوں والی باتیں نہ کریں ماسٹر جی۔ کون سا سونا اور کون سی بھٹی ماسٹر جی۔ ٹڈ سے زیادہ آگ کسی اور چیز میں نہیں ہوتی ساری ذہانت اور لائقی۔ ناک سے باہر نکل جاتی ہے۔ جب پیٹ روٹی مانگتا ہے۔" اماں بھولی نے اپنے پیٹ پر دو ہاتھ مار کے دکھائے۔

"اور آپ جس تعلیم کی بات کرتے ہیں' وہ میں پوری کہاں سے کراؤں گی۔ آٹھویں تک تو ادھر پنڈ کے اسکول سے پڑھ لیا۔ نا بابا نا۔ میں روٹی کی فکر سے مری جاتی ہوں' آپ کہتے ہیں ساتھ میٹھا بھی رکھ لو۔"

اماں بھولی کا سر زور زور سے نفی میں ہل رہا تھا۔

"پانچ جی (پانچ انسان) چھوڑ کر مرا ہے اللہ دتا کا پیو۔ میں کہاں سے پورا کروں گی۔ ایک بات بتائیں ماسٹر جی۔" اماں بھولی کو رونا آنے لگا' مگر آواز کو پوری کوشش سے صاف رکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"کیسے یہ مرد عورت کو کسی کام کا نہیں سمجھتے۔ اس کی عقل مت کو جتی کے تھلے سے جوڑ دیتے ہیں۔ کسی معاملے میں پوچھتے نہیں۔ بولنے نہیں دیتے صاف کہتے ہیں۔ چپ رہ تجھے کیا پتا۔ پر جب مرنے لگتے ہیں۔ سارا سیاپا اس عقل کی انی کے سر پر پا کے یہ جا وہ جا۔ اب میں کیا کیا دیکھوں۔"

"غلط بات بھولی۔ کوئی بھی اپنی مرضی سے نہیں مرتا۔" ماسٹر جی کو ترس آنے لگا۔

"ٹھیک ہے ماسٹر جی!" اماں بھولی نے آنسو پونچھے۔ "کل سے فیقے لوہار کے پاس بٹھا دوں گی۔ تھوڑے ہاتھ پیر سخت ہوں گے جان بنے گی۔ آپ کے قلم شریف نے تو میرے پتر کو بھو زنانی بنا دیا۔ یہ اس کے ہاتھ ہیں۔ مردوں کے ہاتھ کوئی ایسے ہوتے ہیں نرم گرم۔ اس کے پیو کے ہاتھ آپ نے دیکھے نہیں۔ یہ سخت جیسے پتھر۔ اللہ بخشے میرے پر کبھی ایسا ناراض نہیں ہوا کہ مارتا' مگر گھروں میں اونچ نیچ ہو بھی جاتی ہے۔ اس کے ہاتھ کا ایک تھپڑ ہی مجھے بے ہوش کردیتا تھا۔ ست ست دن منہ سوجا رہتا تھا اور یہ۔"

اماں بھولی کو جہاں شوہر کی یاد نے سرشار کردیا وہیں مجرم بنے بیٹھے خاموش بیٹے کو دیکھ کر غم ہرا ہونے لگا۔

ماسٹر صاحب بھونچکے تھے۔ کیا یاد تھی کیا کسک۔ واہ بھولی۔

انہوں نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ پر بمشکل قابو پایا۔ ماں کی پھنکار سنتے اللہ دتا کو دیکھا۔ انہیں ترس آرہا تھا۔ ماں پر بھی اور بیٹے پر بھی۔

"میری بات سنو بھولی غور سے' تمہارا بیٹا بہت لائق ہے' اسے پڑھنے دو۔" "یہاں کا اسکول آٹھویں تک ہے آپ شہر شفٹ ہوجاؤ۔"

"شہر۔" اماں بھولی یوں اچھلی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"ہاں شہر۔۔۔" ماسٹر جی شروع ہوئے پھر بول بول کر منہ تھک گیا۔

"زمین ٹھیکے پر دے دیں۔ سال کے دانے لے لیے جائیں اتنے چھوٹے سے گاؤں میں کون خریدے گا کڑھائی بنائی کے نمونے کہ ہر کسی کو تو آتا ہے یہ کام

کرنا اور سب بڑھ کر اللہ دتا کی تعلیم جو سب سے زیادہ ضروری ہے۔"

"پر شہر کون سا؟ کون سا شہر۔ ہاں ان کا چچازاد بھائی عبدالعزیز اور عبدالمجید۔ وہ شہر میں رہتے ہیں' وہ کچھ نہ کچھ بندوبست کر سکتے ہیں اور یہ بھی تو طے ہو گا ناجو کرنا تھا اب اماں بھولی کو خود کرنا تھا اماں بھولی نے سوئی پکڑلی اور اللہ دتا نے قلم۔ اماں بھولی نے بیٹے کو تو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا' مگر بیٹیوں کے معاملے میں کوئی رسک نہ لیا۔

عبدالعزیز نے اپنی گلی میں آٹھ مرلے کا پلاٹ لے دیا تھا' دو کمرے بھی ڈل گئے۔ اماں بھولی کے پاس پڑا زیور کام آیا۔ دو کمروں کے گھر کو سجالیا۔ ایک بھینس بھی رکھ لی اور صحن کے بیچ و بیچ ڈال دیں دو چار پائیاں۔ اس پر بیٹیوں کو لے کر بیٹھ گئی۔

اللہ دتا کے شدید زور پر بیٹیوں کو اسکول بھی داخل کروادیا' مگر سارا زور کڑھائی سکھانے پر تھا اور یہ بھی کہہ دیا' تو نے جتنی اپنی مرضی کرنی تھی کرلی۔ اب کڑیوں کے معاملے میں نہ بولنا۔

حمیرا سمیرا کی نگاہیں اس وقت ان ہی چار پائیوں پر تھیں۔

حمیرا اور چڑھ کے چوکڑی مار کے عطیہ کے کندھے سے منہ نکال کر اس ٹانکے کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی جو وہ کاڑھ رہی تھی۔ یہ ایک شعوری کوشش مخفی رہنے کی بھی تھی۔

ریاض عین سامنے کرسی ڈال کر بیٹھا تھا۔ گال کی ہڈی پر چوٹ لگی تھی اور حمیرا نے شکر ادا کیا تھا' آنکھ بچ گئی' لیکن اس وقت وہ یہ بھی سوچ رہی تھی۔ چوٹ اتنی بڑی بھی نہیں تھی جتنا بڑا ہلدی کا لیپ پھپھی بھولی نے کر دیا تھا۔

پھپھی وہی سارا قصہ دہرا رہی تھیں اور اپنے عزائم بھی جو کہ وہ پہلے گلی میں کھڑے ہو کر سنا چکی۔

"اب اتنا بھی کچھ نہیں ہوا اماں! جتنا آپ کہہ رہی ہیں۔" ریاض نے اپنے تئیں ماں کو پُرسکون کرنا چاہا تھا پر کہاں پھپھی بھولی دوبارہ شروع ہو گئیں۔ ساتھ وہی کوسنے۔ حمیرا نے تڑپ کر شاکی نگاہوں سے سمیرا بی بی کو دیکھا پر سمیرا عبدالعزیز کو پروفیسر اے ڈی ریاض کے علاوہ کچھ اور کب دکھائی دے رہا تھا۔

ڈھیلے ٹراؤزر اور شرٹ میں سانولا سلونا بلا کا پُرکشش مرد۔ اوپر سے مدھم لہجہ گمبھیر آواز' الفاظ کا چناؤ اس قدر خوب صورتی سے کرتا تھا عشق و تشریح میں عمر گزار دے' وہ کہتا رہے کوئی سنتا رہے اور کوئی کیوں سمیرا عبدالعزیز بن ہی تو رہی تھی۔

"کیسی غدار ہے' اتنا نہیں ہو رہا پھپھی کو ٹوک دے۔ بس کریں اتنا بھی کیا کوسنا۔ شام ہونے کو ہے اگر کوئی ایک کوسنا بھی پورا ہو گیا تو کیا وہ باقی کی زندگی حمیرا ٹنڈی بن کر گزارے گی۔" اسے جھرجھری آگئی۔

"آپ کے اسٹوڈنٹ نہیں آئے آج۔" سمیرا پوچھ رہی تھی۔

"آئے تھے۔" ریاض ہنسا۔ "اماں نے دروازے ہی سے چلتا کیا۔"

"تو اور کیا۔ نظر نہیں آرہا' کتنی چوٹ لگی ہے۔ بولنے سے منہ اور دکھے گا۔" پھپھی نے تائید طلب انداز میں بتایا۔ سمیرا نے جھٹ ہاں میں ہاں ملائی جبکہ حمیرا نے آنکھیں چندھی کر کے بغور دیکھا۔

"بیر کی چھوٹی سی گٹھلی ہی تھی بھائی ریاض۔۔۔ کوئی بنتا تو نہیں تھا جو اتنی ایمرجنسی لگادی۔"

ریاض زور سے ہنس دیا۔ "یہ بات تم اماں کو سمجھا دو۔"

"اے حمیرا! تجھے کیسے پتا' بیر کی گٹھلی لگی تھی۔" اماں بھولی۔۔۔ صرف نام کی بھولی تھی۔ حمیرا کے ہوش اُڑ گئے۔ ملتجی نگاہ سے سمیرا کو دیکھا۔ جو بھائی ریاض کو دیکھ کر ویسے ہی خوش تھی اور ابھی جبکہ وہ ہنس رہا تھا۔ دلکش مردوں کو ہنسنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اس کے دل سے صدا اٹھ رہی تھی۔ وہ دل کی سن کر سر دھن رہی تھی۔ حمیرا کس مصیبت کی لپیٹ میں آنے والی تھی۔ اسے کیا خبر۔۔۔

حمیرا نے اس کی عدم توجہی پر ایک خفیہ چٹکی کاٹی اور آنکھوں میں اپنی صفائی دینے کی التجا کی۔

سمیرا نے ہوش میں آ کر پھپھی کے سوال اور حمیرہ کے تبصرے کو دوبارہ سننے کی درخواست کی (کوئی پوچھے بی بی تمہارا اپنا دھیان کدھر ہے)

"جی وہ گلی میں بچے کہہ رہے تھے۔ گٹھلی تھی بنتا تو نہیں ہے...."

"ہاں وہی تو لوگوں کے خبیث بچے.... پھپھی بھولی فوراً" مان گئیں" یہ آج کل کی مائیں خود دوپہروں کو گھوڑے گدھے بیچ کے سو جاتی ہیں اور بچے گلی میں چھوڑ دیتی ہیں اب وہ جو مرضی بنا ہی ڈالیں۔"

"گھوڑے گدھے بیچ کر.... بزنس وومن گریٹ.... مگر یہ ہیں کون کون سی؟" حمیرا چونکی۔

"محاورہ بولا ہے پھپھی نے....." سمیرا نے تصحیح ضروری سمجھی۔

"اچھا۔ تم لوگ باتیں کرو' میں دو کپ چائے لے آتی ہوں۔" پر عطیہ باتوں میں لگ کر بھول نہ جانا۔ یہ قمیص آج ہی پوری کرنی ہے" جاتے جاتے بیٹی کو تنبیہی نگاہوں سے گھور بھی لیا۔ عطیہ نے بھی سمجھ کر سر ہلا دیا۔ باتیں کرنے والی پیش کش اس کے لیے صرف سننے تک محدود تھی۔

"اور ذکیہ.....!" پھپھی بھولی نے ذرا دور زمین پر اڈا لگا کر بیٹھی بیٹی کو پکارا۔ وہ واش روم جانے کے لیے اٹھی تھی۔ "پالک والی ٹوکری اٹھا کر ان دونوں کے آگے رکھ دے۔"

پھر روئے سخن ان دونوں کی جانب کیا "ایسے فارغ رہ کر باتیں مٹھارنے سے کیا فائدہ۔ پالک ہی صاف کر دو.... میں ہانڈی چڑھا لوں گی ہیں....؟ ٹھیک ہے ناں؟"

"جی.... جی پھپھی...." حمیرا نے جھٹ آستینیں موڑ لیں.... جبکہ سمیرا کی نگاہیں اپنے نکھرے مکھن ہاتھوں پر جم گئیں۔ نازک سا بریسلٹ۔ مسور کی دال جتنے سفید موتی والی نازک انگوٹھی۔ وہ پالک کاٹے یہ کچھ جچتا نہیں۔ حمیرا نے بھی کچھ کہے سنے بنا پوری ٹوکری اپنے آگے دھر لی۔

پھپھی بھولی چائے رکھ کے آئیں تو لہسن' پیاز اور آلو بھی اٹھا لائیں۔

سمیرا بھائی ریاض سے ان کے اسٹوڈنٹس کے حوالے سے بات چیت کرتی رہی۔ اور وہ اس سے اس کے اسکول کے بارے میں بات کرنے لگے۔

تب ہی سمیرا چونکی۔ پھپھی بھولی چھری کے دستے سے اس کا گھٹنا ہلا رہی تھیں۔ سمیرا کی سوالیہ نگاہوں پر.... لہسن بھری پلیٹ اس کی گود میں رکھ دی۔

"دیر ہو رہی ہے ہانڈی کو' یہ لہسن چھیل دو۔"

"میں.... میرا مطلب ہے' میرے ناخن خراب ہو جائیں گے۔ میں یہ پالک صاف کر دیتی ہوں۔" سمیرا کا انداز گھبرایا ہوا تھا۔

"اوہاں!" پھپھی نے سر پر ہاتھ مارا۔ "میں تو بھول ہی جاتی ہوں' میری اس بھتیجی کو کہاں عادت ہے ایسے کاموں کی۔" پھپھی کا انداز محبت سے بھرپور تھا۔

"ایسے گورے چٹے چمکتے ہاتھ بھلا ان کاموں کے لیے تھوڑی بنے ہیں۔ یہ تو ہم جیسوں کے کام ہیں۔" پھپھی نے اپنی دونوں ہتھیلیاں پھیلا دیں۔ کھردرے' سخت محنت کش ہاتھ.....

سمیرا نے اس تبصرے کو اعزاز کی طرح وصولا اور نزاکت سے پالک کے پتے چننے لگی۔ جیسے باغیں باغ میں کوئی ترک شہزادی پھول چننے آئی ہو۔

حمیرا اونچی آواز سے عطیہ کو سنائے گئے اپنے لطیفے پر خود ہی ہنس رہی تھی اس کے ہاتھوں میں بہت تیزی تھی۔ (پھوہڑ پنا اپنی جگہ مسلم)

گلی کا بچہ پیغام لایا تھا۔ "سمیرا باجی! آپ کی امی بلا رہی ہیں۔ کہتی ہیں بہت دیر ہو گئی ہے۔"

سمیرا سنتے ہی کھڑی ہو گئی۔ امی کو اے ڈی کی موجودگی میں سمیرا کا جانا کبھی پسند نہیں رہا تھا۔ وہ سرعت سے گیٹ پار کر لینا چاہتی تھی۔ جب جھٹکے سے کھنچتی چلی گئی۔ اس کا ہاتھ اے ڈی کے ہاتھ میں تھا اور وہ اس کے روبرو۔

"یہ کیا؟" اس کا اشارہ اس جرات پر تھا۔

"تمہارا ہاتھ ہے۔" شوخ جواب حاضر۔

"آپ نے پکڑا کیوں ہے؟" اس کی نگاہیں حمیرا پر تھیں جو الوداعی گفتگو کر رہی تھی۔

"چھوڑدوں؟" کیسا ظالمانہ سوال تھا۔ چڑ کے لگنے جیسا... سچ بولے کہ جھوٹ' اس نے جواب کے بجائے خود سے چھڑانے کی کوشش کو بہتر سمجھا۔
"اتنی کوشش کیوں... تم کہہ دو' میں چھوڑ دوں گا۔" اے ڈی کو اس کے چہرے کی سرخی اکسا رہی تھی۔
"چھوڑدیں..." وہ تپ گئی۔
"دیکھ لو..." وہ کیا دکھا رہا تھا۔
"میں نے دیکھ لیا ہے۔ اگر پھپھو نے دیکھ لیا تو..."
سمیرا نے آئینہ دکھانا مناسب سمجھا۔
"وہ نہیں دیکھیں گی' ان کا دھیان حمیرا سے باتوں پر ہے۔" اے ڈی بے فکر تھا۔
"میں آواز دوں گی تو وہ دیکھ لیں گی۔ حمیرا...!" اس نے پکار بھی لیا۔ "جلدی آؤ۔" ہاں جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہاتھ چھٹ گیا تھا۔
سمیرا کی ہنسی چھوٹی۔ "بس اتنی سی ہمت تھی۔"
"امتحان لیا ہے۔" اے ڈی کی نظریں اس کے صبیح چہرے پر سرک رہی تھیں۔
"اوں ہوں۔" سمیرا نے لب کا کونا دانتوں میں داب کر انکار میں سر ہلایا۔ "کیا امتحان لوں' آپ تو ٹیسٹ ہی میں فیل ہو گئے۔"
"اچھا۔" اے ڈی نے دوبارہ ہاتھ بڑھایا مگر سمیرا الرٹ تھی' سرعت سے پیچھے ہوئی۔ "یاد رکھنا اے ڈی ریاض فیل ہونے والا بندہ ہے ہی نہیں۔"
"اوہ۔" سمیرا کے ابرو تنے۔ اے ڈی نے سر ہلا کر دوبارہ تصدیق کی۔
"وہ اس لیے جناب کہ امتحانی کمرہ میں پھپھو آپ کے ساتھ نہیں ہوتیں۔" اس کا لہجہ شریر مگر جملہ حقیقی تھا۔
"ہاہاہا...!" اے ڈی کی ہنسی چھوٹ گئی۔
"ہیں اللہ دتہ... کلے کلے کس بات پر ہنسی آئی ہے۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں۔ ہنسنے کی ضرورت ہی نہیں۔ منہ میں درد ہو گا میرے بچے۔" پھپھو کی آواز بلند تھی۔

"جی اماں... میرا مطلب ہے نہیں اماں!"
"فون پر بات کر رہا تھا؟"
"ہاں تو وہی تو کہہ رہی ہوں۔ چپ رہ' منہ درد کرے گا سوہنے۔"
پھپھو کا لہجہ فکر مندی سے بھرپور تھا۔ اے ڈی نے لب بھینچ لیے۔
سامنے کھڑی سمیرا کو دیکھا۔ لبوں پر مسکراہٹ' آنکھوں میں شرارت ساتھ ساتھ جتاتا تاثر... اے ڈی ایک قدم بڑھا پھر بری طرح گھبرا کر چونکا۔
"دے دیں..." دونوں ہاتھوں سے دیں... حمیرا کی صدا دوستانہ تھی۔ سمیرا نے پرسکون سانس بھری حمیرا نے باری باری دونوں کو دیکھا پھر اپنے جملے کی وضاحت دی۔
"دعائیں..." اس نے ہاتھ اٹھا رکھے تھے۔
"دعائیں دیں اس شخص کو' جس نے آپ کو پھر یہ موقع فراہم کیا۔ ہے ناں۔"
اے ڈی نے سر ہلا کر تائید کی' واقعی اسی حادثے سے تو ملاقات کی صورت بنی۔
تقریب بہر ملاقات چاہیے (خواہ چوٹ کھا کر ہی ہی ہی) البتہ سمیرا پھر پھاڑ نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

گھر آنے پر نیا تماشا منتظر تھا۔ حمیرا کے نام کی پکاریں پڑ رہی تھیں۔
"کیا ہوا... کیا ہوا تایا ابو...؟" وہ ہراساں افتم پشتم پہنچی۔ سب خیریت ہی نظر آ رہی تھی۔ ہاں امی کے چہرے پر تناؤ تھا۔
"میں کب تک ایسے کھڑا رہوں۔" تایا ابو کے ہاتھ میں آفس والے بوٹ تھے۔ پیروں میں موزے... عجب لاچاری سے کھڑے تھے۔
"کیوں کھڑے ہیں... آپ کو بڑی امی نے سزا دی ہے؟ کیوں؟" گردن موڑ کر بڑی امی کو دیکھا۔
"سزا کی بچی... وہ صوفٹی کے لیے کھڑے ہیں۔" یہ

غصیلی پھنسی آواز صفیہ کی تھی۔
"کیوں.... اوہ.... سوفٹی...." وہ تو حمیرا کے پیروں میں تھی۔
"اتنی سی بات پر آپ اتنا گھبرا گئے تایا ابو۔" اس نے جلدی سے جوتا اتارا "آپ کے پاس اور سوفٹی نہیں ہے؟" انداز ڈپٹتا ہوا سا تھا۔
"تمہارے پاس اور سوفٹی نہیں ہے۔" انہوں نے الٹا سوال کر دیا۔
"ہے ناں.... مگر جو مزہ اسے پہن کر۔ آتا ہے" وہ کسی اور میں کہاں۔"
وہ کرسی پر گر کر لمبی سانسیں لینے لگی۔ اللہ جانے پھپھی نے اتنی ڈھیر پالک' ہفتہ بھر کھانی تھی۔ کمر اکڑ گئی۔
"اور یہ تمہارے ہاتھوں کو کیا ہوا ہے؟" بڑی امی کی تشویش بھری آواز پر صفیہ چونکیں چونک تو حمیرا خود بھی گئی' یہ کیسے ہاتھ تھے سبز سے یا سیاہ سے۔
"اوہ!" اگلے منٹ وہ سمجھ گئی۔ "پھپھی بھولی کے ساتھ پالک بنوا رہی تھی۔"
"جاؤ' جلدی سے دھو آؤ۔ نشان سارا جاتا ہے۔" بڑی امی نے تاسف سے سر ہلایا۔ گہرے رنگ کے سوٹ پر بھی ہریالی کے دھبے محسوس ہو رہے تھے۔
صفیہ کی نگاہیں سمیرا پر ٹک گئیں۔ وہ بریسلیٹ اتار رہی تھی۔
"اس نے تو نہیں مدد کروائی مگر یہ ان کی اپنی بیٹی حمیرا عبدالمجید۔"

☼ ☼ ☼

"اوں ہوں.... زیادہ تیز قدم اٹھانا ٹارگٹ نہیں ہے۔ بس تم نے چال کو سیدھا رکھنا ہے۔"
"اوہ....!" وہ ٹھٹھکا "لنگڑاہٹ محسوس ہونے لگی تھی؟" اس نے باپ سے پوچھا۔
"ہاں بیٹا.... تم یہ سمجھو کہ تم ایک سال کے بچے ہو اور چلنا سیکھ رہے ہو۔ دھیرے دھیرے چھوٹے قدم۔"
"میں ایک سال کا نہیں ہوں ابو۔" اس کے منہ سے پھسلا پھر وہ شرمندہ ہو گیا۔ اس کے جملے میں مایوسی تھی اور بے حد پر امید و پر یقین باپ کے لیے یہ لہجہ و جملہ کسی زہر میں بجھے نیزے کی طرح تھا۔ ابو کے چہرے کا رنگ اڑا تھا مگر وہ فوراً" سنبھلے تھے۔
"میں جانتا ہوں مگر یاد رکھو' تمہیں دوبارہ جینے کا موقع ملا ہے۔ ہر چیز کو دوبارہ سیکھنے کا.... ایک زندگی میں دوبارہ جینا' سیکھنا' سمجھنا ہر ایک کے لیے نہیں ہوتا۔ اللہ کبھی وہ حکم نہیں دیتا جس کے بارے میں جانتا ہو کہ اس کا بندہ پورا انہیں کر سکے گا۔"
ان کے جملے ان کے پختہ ایمان کی ترجمانی کر رہے تھے۔
"آپ ہمیشہ سے اتنے پر یقین تھے یا اب ہو گئے ہیں؟" اس کے لبوں پر ہلکا تبسم تھا۔
"اب ہو گیا ہوں۔" وہ مسکرانے لگے۔ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔
دھیرے دھیرے.... دھیمے قدم۔
ڈاکٹر نے ہدایت کی تھی۔ اب اسٹک چھوڑ کر خود سے چلنے کی پریکٹس کرنی ہے۔ وہ انکار کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کا باپ اور پھر ماں.... دونوں ڈاکٹر کو بغور سن رہے تھے۔ انہوں نے بیٹے کے چہرے کے رنگ بھی دیکھے۔ آنکھوں سے جھلکتا خوف و بے یقینی وہ اسٹک کیسے چھوڑ سکتا ہے۔
اس کی ماں نے اس کے کچھ لرزش زدہ ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔
"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب.... یہ اسٹک چھوڑ دے گا۔"
"مگر امی....!" وہ خوف زدہ سا ہو کر.... ان کی شکل دیکھنے لگا۔
"بیٹا! ڈاکٹر صاحب کو بتاؤ کہ تم اسٹک کو چھوڑ سکتے ہو۔" ماں کے فیصلہ کن اعلان پر اس نے باپ کی طرف امید سے دیکھا تھا۔
مگر وہ تو کچھ اور ہی بولے۔
وہ ڈاکٹر صاحب کو بتا رہے تھے یا اس کو.... کہ وہ کر

سکتا ہے' وہ کرے گا اور ان کے لہجے کے یقین پر' آنکھوں کے عزم پر حیران ہونے کے باوجود اس کا سر اثبات میں ہلنے لگا۔

"ہاں وہ کرے گا۔ ابو کہہ رہے ہیں تو وہ کرلے گا۔"

اور اتنے دنوں بعد سہی۔۔۔ بہت مشکل سے سہی۔۔۔ بہت تکلیف کے ساتھ۔۔۔ وہ اسٹک چھوڑ چکا تھا۔

اب بغیر اسٹک کے چلتا تھا اور ڈاکٹر نے کہا تھا۔ چال سیدھی رکھنی ہے۔ کمر سیدھی اور تنی ہوئی۔ کہیں خم نہیں کھانا۔۔۔ کچے ٹوٹے قدموں کے ساتھ ہی سہی۔۔۔ مگر وہ جو چال اپنالے گا وہی مستقل ہوجائے گی اور وہ چلتا تھا اور ابو اس سے چند قدم پیچھے رہ کر اس کی چال پر نظر رکھتے تھے۔

بیٹا جوان ہوجائے تو باپ کو چال چلن پر نگاہ رکھنی پڑتی ہی ہے۔۔۔ ورنہ بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے۔ ان کا بیٹا جوان ہوا تھا اور بگڑا تو قطعا" نہیں تھا' لائق فائق بیٹا' فرماں بردار مگر پھر بھی انہیں اس پر نظر رکھنی پڑ گئی تھی۔

"آہ۔۔۔!" وہ چند قدم پیچھے چلتے تھے اس لیے آنسو چھپانا مشکل نہیں ہوتا تھا۔ بیٹے کے روبرو آتے تو مسکراتا' پرعزم' باہمت چہرہ ہی ہوتا تھا۔

اب دونوں ہم قدم چل رہے تھے۔ دھیمی چال۔۔۔ صبح کی سیر۔۔۔

نماز کے بعد آسمان کے سارے سرمئی شیڈز دیکھنا ایک دلچسپ کام تھا۔ سیاہی سے سفیدی کے سفر میں وہ درمیانہ رنگ۔۔۔ بتاتا تھا ایک دم کچھ نہیں ہوتا۔

دھیرے دھیرے۔۔۔ صبر سے۔۔۔

دونوں باپ بیٹا۔۔۔ آسمان پر نگاہیں جمائے بیٹھ جاتے ہیں۔ خاموشی کے ساتھ آسمان کو دیکھنا' صبح ہوتی تھی۔۔۔ جیسے کسی راز سے پردہ ہٹتا ہو' چپکے سے۔ سفید رنگ پر سیاہی جلدی چڑھتی ہے۔

لیکن اگر سیاہ کو سفید رنگ دینا ہو مشکل بہت مشکل۔۔۔ مگر ناممکن تو نہیں۔۔۔

ہاں یہ ہے کہ وقت زیادہ لگ جاتا ہے۔ تحمل کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ بیٹے کی بحالی صحت کا خواب' خواہش' ضرورت' سیاہی سے سفیدی کے سفر جیسی ہی تو تھی۔ سفید بے داغ۔۔۔ بے عیب کاملیت۔

تو جیسے صبح کی سیاہی غیر محسوس طریقے سے رنگ بدلتی ہے۔ سرمئی اندھیرا اور پھر سرمئی اجالا اور آخر میں روشن سویرا۔۔۔

تو سیاہی گزر چکی تھی اور سرمئی اندھیرا ابھی ڈھلنے کو تھا۔۔۔ (اسٹک چھوٹ رہی تھی) یعنی سرمئی اجالا۔۔۔ اور پھر روشن صبح۔ آہ مالک۔۔۔ جیسے یہ ہر سو روشنی پھیل گئی ہے تو ایسے ہی ایک دن سب ٹھیک ہوجائے گا۔

ان کی آنکھ میں نمی تیرنے لگی تھی۔

"تو آپ نے جتایا نہیں ابو؟" وہ چلتے چلتے رک گیا تھا۔

"کیا۔۔۔؟" انہوں نے تیز تیز پلکیں جھپکیں۔

"یہی کہ۔۔۔" وہ ان کی جانب گھوم گیا۔ "آپ ہمیشہ سے اتنے پر یقین تھے یا اب ہوگئے ہیں۔"

وہ مسکرانے لگے۔ مسکراہٹ کی چمک نمی کو پی گئی تھی۔

ان کی نگاہیں چہار سو دیکھنے لگیں۔ چمک دار دن۔ سنہرا سا۔۔۔

اپنے دوپٹوں کو کستی آگے پیچھے بھاگتی مدرسے کی بچیاں۔۔۔ ان کی آوازیں یہاں تک آرہی تھیں۔ جیسے چڑیاں چہچہا رہی ہوں۔ باپ بیٹے کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"میں نے بالکل صحیح دوپٹا اوڑھا ہے۔ ایک بھی بال دکھائی نہیں دیتا۔"

"جی نہیں۔۔۔ وہ دیکھو' کان کے پاس سے نظر آرہے ہیں۔" دوسری نے چڑایا اور بھاگ گئی۔

پہلے والی نے خفگی سے اسے دیکھا اور رک کر دوبارہ اوڑھنے لگی۔ رنگین اوڑھنیاں اور ادھر زمین کی اوڑھنی سبز تھی۔۔۔ سبز کے سارے شیڈز۔۔۔

لائٹ اینڈ ڈارک کے کنٹراسٹ۔۔۔ واہ مولا تیرے رنگ۔۔۔

انہیں شان کریمی یاد آنے لگی۔ ٹھنڈی ہوائیں۔۔۔ وہ کچھ زیادہ دور تک چل کر آگئے تھے۔ بیٹے کو واپس

جانے میں مشکل ہوتی۔ وہ یک دم مڑ گئے۔ اسٹک بیٹے کو پکڑا دی تھی۔ ڈاکٹر نے ابھی صرف اسٹک چھوڑ کر خود سے چلنے کی مشق کے لیے کہا تھا۔ لڑکھڑاتے قدموں ہی سے سہی مگر وہ چلنے لگا تھا۔ مگر گھر تک جانے کے لیے اسٹک چھوڑنا بے وقوفی تھی۔ جسم ایک دم اتنا دباؤ برداشت کرنے کے قابل نہیں تھا۔

مگر وہی امید۔۔۔

"ابو۔۔۔" وہ چونکے۔ بیٹا منتظر نگاہوں سے جواب چاہتا تھا۔

"جب میں نے تمہارے ایکسیڈنٹ کی خبر سنی' وہ میری زندگی کی بھیانک ترین خبر تھی۔ میں جیسے اندھا ہو گیا۔ اسپتال آنے تک میں نے خود کو کسی بھی بری خبر کے لیے تیار کر لیا تھا۔۔۔ میں سوچ چکا تھا۔ لوگ یوں ہی مجھے بہلا رہے ہیں۔ زخمی بتا کر لا رہے ہیں۔ جبکہ حقیقت میں۔۔۔"

اس وقت کی یاد حلق میں کرچیوں کی طرح چبھتی تھی۔ اب بھی خراشیں پڑنے لگیں۔ مگر وہ بول رہے تھے۔

"پتا ہے' میرے قدم ایمرجنسی کے بجائے کہیں اور اٹھتے تھے میں نے تمہیں مردہ سوچ لیا تھا۔ اور صبر کا بھی سوچ لیا تھا۔ مگر جب میں نے تمہیں زندہ دیکھا۔ اتنے بڑے حادثے کے بعد زندگی فقط وہم رہ جاتی ہے' جب تمہاری کراہ سنی۔۔۔ تم نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور لاچاری سے میری طرف ہاتھ اٹھایا۔۔۔ آواز مجھ تک نہیں پہنچی تھی مگر تمہارے ہلتے لب ابو کہہ رہے تھے۔ تب یک دم میرے دل سے سارے خدشات دور ہو گئے۔ سارے برے خیال میں نے خود سے دور جھٹک دیے۔ اتنی بڑی تباہی کے بعد تم زندہ تھے دیکھ رہے تھے پکار رہے تھے' تو میں نے خود سے کہا۔ میرے بیٹے کو کچھ نہیں ہو گا۔۔۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

میں ٹوٹا تھا مگر میں نے ان ہی قدموں اپنے ٹکڑے سمیٹ کر خود کو کھڑا کر دیا۔

میں نے سوچا جس نے وہاں بچا لیا وہ اب بھی بچائے گا۔ زندگی شرط ہے۔ مشکلیں تو آنی جانی ہوتی ہیں۔۔۔ یار! بہادر تھا نہیں۔۔۔ مگر ہو گیا" وہ مسکرا رہے تھے اور وہ انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

"ابو۔۔۔!" پھر بے ساختہ ان سے لپٹ گیا۔ ان کے قد او نچا بیٹا۔ دونوں گھر کی طرف چلنے لگے۔

ابو نے لاڈ سے اس کے شانے پر بازو ٹکا لیا جیسے اچھے دوست۔۔۔ پکے والے۔

☼ ☼ ☼

"مارنے والے سے چوک ہو گئی۔" بڑی امی نے اپنے دکھتے سر کو بری طرح محسوس کرتے ہوئے بے ساختہ سوچا۔ "نشانہ بھولی ہونا چاہیے تھی' کتنا بولتی ہیں بھولی آپا اف۔۔۔"

انہیں نہیں دوسرے دن شام میں وقت ملا کہ وہ جا کر اللہ دتہ ریاض کی خیریت معلوم کر آئیں۔ عبدالعزیز صبح کام پر جاتے ہوئے پوچھتے گئے تھے۔ صفیہ بھی چکر لگا آئی تھیں۔

"سارا شہر مل کر چلا گیا بس ایک میری بھابھی کو اب وقت ملا۔"

یہ استقبالی جملہ تھا۔ بڑی امی نے مجبور سا چہرہ بنا لیا۔ "آپ کو پتا تو ہے میری مصروفیات۔۔۔"

جواب میں پھپھو بھولی نے اپنی مصروفیات کی کہانی چھیڑ دی۔ بات شروع ہوئی تو خاتمے کا راستہ بھول گئی۔ ان کا جمائیاں روک روک کر جبڑا دکھ گیا۔

اللہ دتہ ریاض کی چوٹ پس منظر میں چلی گئی۔ دنیا' اخلاق' معاشرت مہنگائی' تربیت و سلیقہ' بدحالی' بے عقلی' دنیا کی نئی احمقانہ روش۔۔۔ وہ کون سا موضوع تھا جس پر پھپھو نے سیر حاصل گفتگو نہ کی ہو۔۔۔ بلکہ گفتگو تو دو افراد کے بیچ ہوتی ہے۔ انہیں تو ایک لفظ بھی کہنے کا موقع نہ ملا۔ تائیدی ہوں ہاں کی بھی گنجائش نہیں۔ وہ بس چہرے کے تاثرات سے ایکشن دیتی رہیں لہٰذا اسے پھپھو بھولی کا خطاب کہنا زیادہ مناسب تھا۔

اوپر سے وہ جب اٹھنے کی کوشش کرتیں۔ پھپھو ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیتیں۔

پھر اللہ دتہ ریاض کا منہ اپنے ہاتھوں سے اوپر کر کے دکھایا۔ جیسے قربانی کے جانور کے دانت دیکھنے کے لیے اس کے منہ کو جکڑ لیا جاتا ہے۔ ذرا سی چوٹ تھی۔

"اللہ کا شکر ہے۔" بڑی امی نے کہا۔

"ہیں بھابھی.... میرے پتر کو چوٹ لگ گئی اور آپ شکر کہتی ہیں۔" پھپھو بھولی نے تڑپ کر کہا۔

"ہاں شکر ہے' ذرا سی چوٹ ہے۔ آنکھ بچ گئی۔ باقی چھوٹے موٹے زخم تو جان کا صدقہ ہوتے ہیں۔ اللہ سے قریب کرتے ہیں۔ اللہ کی پہچان کروا دیتے ہیں۔ اور اللہ کی حد نگاہ اور پہنچ تک کون پہنچا ہے۔ وہ بچانا چاہے تو شیر خوار موسیٰ کی ٹوکری نیل پار کر جاتی ہے مکڑی غار کے آگے جالا بن دیتی ہے۔ عیسیٰ پیدا ہوتے ہی ہم کلام ہو جاتے ہیں اور پکڑنا چاہے تو لوگ کیلے کے چھلکے سے بھی پھسل جاتے ہیں۔"

بڑی امی کی آواز میں لرزش آگئی۔ پھر خود ہی خود پر قابو پا کر مسکرانے لگیں۔

"اسی لیے میں نے شکر کہنے کی عادت ڈال لی ہے۔ ولی اللہ نہیں ہوں آپا! پکی دنیا دار ہوں مگر میں یہ سوچ لیتی ہوں۔ جو ہوا ہے۔ اس سے برا بھی ہو سکتا تھا۔ سو آپ بھی کوسنا چھوڑ کر صدقہ دیں' بیٹے کی بچت ہو گئی۔"

"یہ تو تم نے ٹھیک کہا بھابھی۔" پھپھو بھولی بہت کم مانتی تھیں۔

"میں تو پہلے ہی کہتی ہوں' میری بھابھی بہت عقلوں والی ہے۔ ہمت والی' دل والی.... کیسے سلیقے سے بچے پالے۔ گھر سنبھالا۔ یتیم بھتیجی کو اولاد سے بڑھ کر رکھا۔ عبدالعزیز نے کوئی نیکی کی ہو گی جب ہی اسے ایسی پیاری' عقل والی بیوی ملی۔"

پھپھی کو بولنے کا نیا موقع مل گیا۔ وہ تعریف و توصیف والے ٹریک پر چڑھ گئی تھیں۔ اب وہاں تک جاتیں جہاں تک پٹڑی جاتی۔

مگر شکر ہوا' اللہ دتا ریاض کے کوئی کولیگ آگئے تو انہیں اٹھنے کا موقع ملا مگر تب بھی تماشا ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

"آپ کہاں سے آرہی ہیں؟" حمیرا کی انگلیاں کھلے منہ پر ٹک گئیں۔ فریج سے پانی کی بوتل نکالی۔ سمیرا فریج بند کرنا بھول کر ماں کو دیکھنے لگی۔ صفیہ کے عام طور پر بے تاثر رہنے والے چہرے پر حیرت نمودار ہو گئی۔

ماں کے پیچھے داخل ہوتا معید بھی ہکا بکا ہو گیا۔ اتنا بڑا گلابوں والا بکے انہوں نے دونوں ہاتھوں میں یوں اٹھا رکھا تھا جیسے ایک صحت مند شیر خوار بچہ۔

"ہر رنگ کے گلاب...." سمیرا نے مسحور ہو کر لمبا سانس کھینچا۔

حمیرا نزدیک آگئی۔ سر سے پیر تک بغور دیکھا۔ کئی بار کا پہنا ہوا کریمی پرنٹڈ چکن کا جوڑا.... دھلا دھلایا منہ.... مگر بڑی امی کو سنگھار کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ سمیرا عبدالعزیز کی والدہ ماجدہ تھیں۔ سمیرا نے سارا حسن ان سے چرایا تھا۔ بڑھاپا آگیا تو کیا ہوا۔

حمیرا تو بہانگ دہل کہتی تھی۔ اگر ففٹی پلس کا مقابلہ حسن ہو بڑی امی ہی ونر ہوں گی۔

"مگر حسن بے پناہ کا یہ مطلب تو نہیں۔ انہیں اتنے شدید قسم کے حسین گلابوں کا بکے دے دیا جائے۔ مگر دیا کس نے....؟" وہ سخت مشکوک نگاہوں سے ان کے گرد چکر کاٹنے لگی۔

"ایسے موقعوں کے لیے ایک فلمی ڈائیلاگ بڑا فٹ ہوتا ہے۔"

اس نے اپنی کنپٹی بجائی سمیرا اور معید دونوں نے نفی میں سر ہلایا۔ انہیں کوئی ڈائیلاگ یاد نہیں تھا۔

"ہاں....!" چکر پورا ہونے پر حمیرا بڑی امی کے روبرو آگئی۔ سخت چبھتی ہوئی نگاہ۔ تفتیشی کڑا انداز....

"کہاں سے آئے ہیں یہ پھول....؟"

"کیا؟" دماغ تو پھپھی بھولی خالی کر چکی تھیں۔ سوال سر سے گزر گیا انہیں خود اپنا آپ اتنا عجیب لگ رہا تھا' اتنا بڑا جمبو بکے پکڑ رکھا تھا۔ حسن اپنی جگہ' شوہر کی چہیتی بھی تھیں مگر انہوں نے بھی کبھی ایک کلی بھی نہیں دی تھی۔ ان کا بکے پکڑنے کا تجربہ ہی نہیں تھا'

ابھی گلی سے گزرتے ہوئے بھی اتنی شرم سی آرہی تھی۔

"کس نے دیے ہیں یہ پھول؟" سمیرا کا لہجہ متبسم تھا اس نے جھک کر ایک طویل سانس کھینچا۔

"سمیرا...!" بڑی امی کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ "یہ بھی کوئی طریقہ ہے کوئی ماں سے یوں سوال کرتا ہے۔" شرم کی سرخی... غصے کی لالی میں بدلنے لگی۔ وہ کچھ بولنے لگی تھیں۔ مگر جملہ منہ میں رہ گیا۔ معید ان سے لپٹ گیا تھا۔

"میں بالکل نہیں پوچھوں گا کیوں دیے ہیں یہ پھول... کیونکہ میری امی ہیں ہی اتنی پیاری کہ انہیں کوئی بھی پھول دے سکتا ہے۔"

معید نے گال بھی چوم لیا۔ محبت کے اس مظاہرے پر سب کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ مگر حمیرا نے آنکھیں گھمائیں۔

"تم ہو گئے اتنے لبرل۔" اس نے ہاتھ نچایا۔ "مگر میں اپنے تایا ابو کو بتا کر رہوں گی کہ آج اس گھر میں ہوا کیا ہے۔ اتنا بڑا بکے اور بڑی امی نے کیسے گود میں لے رکھا ہے جیسے آٹھ ماہ کے معید کو اٹھاتی ہوں گی یعنی کہ غضب خدا کا۔"

"بدتمیز لڑکی...!" بڑی امی نے معید کو خود سے دور کیا۔ بڑے چھوٹے کا لحاظ ہی نہیں... جو منہ میں آیا بول دیا۔ لو پکڑو اپنے آٹھ ماہ کے لاڈلے کو۔" انہوں نے بکے اس کی طرف اچھال دیا۔

"ہائے...!" حمیرا بمشکل گرنے سے بچا پائی منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "ماں صدقے...!" سمیرا اور معید کی ہنسی بے قابو ہوگئی۔ صفیہ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ بڑی امی تخت پر بیٹھ رہی تھیں سر پکڑ کر۔ وہ بھی ہنس دیں۔

سب کو ہنستا دیکھ کر حمیرا چونکی پھر اپنے جملے اور انداز کو یاد کرکے وہ بھی تخت پر ڈھے گئی۔ بکے اپنے چہرے پر ڈال لیا۔ لمبا سانس بھرا اور ہنستی چلی گئی۔

"سیدھی ہو جاؤ۔ سارے پھول مسل دیے تم نے۔" سمیرا نے بکے اٹھا کر اپنے چہرے سے جوڑا۔

حمیرا اٹھ بیٹھی۔

"سوال اب بھی وہیں ہے۔ یہ پھول کہاں سے آئے ہیں۔ جہاں تک میری معلومات ہیں آپ تو بھائی ریاض کی خیریت معلوم کرنے گئی تھیں تو بکے لے کر جانا تو سمجھ میں آتا ہے لے کر آنا... کیا انہوں نے آپ کے پھول قبول کرنے سے انکار کیا یا آپ کو پھول پیش کیے ہیں۔"

حمیرا نے کمر پر ہاتھ رکھا۔ سمیرا نے چونک کر ماں کو دیکھا اور پھولوں کو... غیر ارادی طور پر غیر محسوس طریقے سے بکے کو اپنے بازوؤں میں کس سا لیا تھا۔ معید کا دھیان نہیں تھا۔ حمیرا کو عادت نہیں تھی دھیان دینے کی... مگر صفیہ نے سمیرا کے رنگ کی سرخی کو محسوس کیا تھا۔ بڑی امی اپنا دوپٹا تہہ کرنے لگیں۔

"بتایئے بتایئے۔ اب آپ چپ کیوں ہیں۔"

"ناظرین! یہ خاموشی؟ کیا وجہ ہے اس کی... کیا اس بات میں کوئی بات ہے؟ تو وہ کیا بات ہے ناظرین آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ خاتون کچھ بھی بولنے سے انکاری ہیں۔"

حمیرا نے ہاتھ کا مکا بنالیا۔ وہ اچانک نیوز رپورٹر ہو گئی تھی۔

"امین حفیظ کالیڈی ورژن..." مائیک بڑی امی کے منہ سے جوڑ دیا۔ انہوں نے منہ موڑا... اس کا مائیک بھی رخ بدل کر سامنے...

"آپ دیکھ رہے ہیں ناظرین یہ جواب دینا نہیں چاہتیں یہ کچھ چھپا رہی ہیں۔ یہ بچ رہی ہیں... یا کسی کو بچانا چاہتی ہیں۔ یہ..."

"ہٹاؤ..." بڑی امی نے مائیک پر ہاتھ مارا... مائیک کی ایسی کی تیسی ہوگئی۔

"ہائے...!" مائیک کی آہ نکل گئی۔

"بس کردو حمیرا...!" سب سے زیادہ بے زاری صفیہ کو ہوئی تھی۔ وہ پھلیاں کاٹ رہی تھیں۔ ورنہ کب کی جاچکی ہوتیں۔

"ایسے کیسے بس کردوں... آخر ہمیں بھی تو پتا لگے

یہ ہو کیا رہا ہے۔ مجھے تو آج تک کسی نے پھول نہ دیا ۔۔۔ پھول چھوڑو' پنیری بھی نہیں دی کہ چلو جاؤ اپنے گملے میں لگالو۔۔۔ پھول ہی پھول ۔۔۔ اور مجھے تو چھوڑو ۔۔۔ سمیرا کو کسی نے پھول نہیں دیے حالانکہ یہ تو وہ ملکہ ہے۔ جس کے نام باغ لکھوا دینا چاہیے۔ ہے ناں سمیرا ۔۔۔ کیوں معید؟"

"ہاں ہاں بالکل ۔۔۔" معید سیدھا ہو بیٹھا۔ اس نے پیار سے بڑی بہن کو دیکھا۔ اتنے سارے پھولوں کے ساتھ ۔۔۔ وہ پھولوں سے زیادہ دلکش لگ رہی تھی۔

صفیہ کے دال چنتے ہاتھ بھی رک گئے تھے۔ اپنی تعریف پر کچھ جھینپ کر مسکرائی۔ گھنی مڑی پلکوں کی باڑ کے پار۔۔۔ نین کٹورے جھلملاہٹ سی ۔۔۔ ٹمٹما دیا۔۔۔ شکر حسن کو دوام نہیں۔۔۔

اور شکر کہ ایسا حسن عام نہیں۔۔۔

شکر چہرے اللہ خود گھڑتا ہے۔

ورنہ زندگی الزام تراشیوں میں گزر جاتی۔ چھیننے جھپٹنے میں ختم ہو جاتی۔ آئے دن لوگ چہرے بدلتے۔ خود کو سنوارنے سجانے میں دوسرے کی گردنیں بے چہرہ کر دیتے۔ ہر انسان سرکٹا۔۔۔

شکر اس نے انسان کو اس کی اوقات میں رکھا' ورنہ یہ انسان۔"

صفیہ کا ہاتھ چھری کے دستے پر اتنا سخت ہو گیا۔ کہ اپنے خود کے ناخن ہتھیلی میں دھنسنے کی تکلیف سے چونک اٹھیں۔

"ہے ناں امی! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں۔"

"آں ہاں ۔۔۔" صفیہ نے اپنا ہاتھ دھیرے سے مسلا۔ "ہاں ماشاء اللہ ۔۔۔" مسکرا کر سمیرا کو دیکھا۔

کیسا بجت کرا دینے والا جادو اثر جملہ تھا۔ مزید کہنے سننے کی گنجائش ہی رہتی۔ صفیہ کی جان چھوٹی ۔۔۔ باقی سب مطمئن ہو گئے۔ واہ اللہ تیرے رنگ' کیسے تو بچالیتا ہے۔

"کس نے دیے ہیں پھول؟" لے کر کھڑے کھڑے پورا خبرنامہ بنالیا" بڑی امی نے پھلیوں کی چنگیر اپنی طرف کھسکائی۔

"اللہ دتہ ریاض کے کولیگ اور اسٹوڈنٹ وغیرہ آئے تھے۔ یہ گلدستہ ساتھ لائے۔ وہ بے چارہ چائے کا کہنے آیا۔ پندرہ سولہ لوگ تھے۔ ماں کو گلدستہ پکڑا کر بولا "چائے بنادیں۔" بھولی آپا کو پتنگے لگ گئے۔ پہلے بولیں "عیادت اور پرسے کے گھر چائے پانی نہیں پینا چاہیے۔ میں تو ہول گئی۔" اللہ رحم کرے' پرسے کی کیا بات ہے' چائے کیا ہے' میٹھا کر پانی۔"

"دودھ پتی بھول گئیں بھابھی۔" پھر اللہ دتا کی طرف گھومی ۔۔۔ "یہ پھول کیوں لائے ہیں؟"

"اماں جی ۔۔۔ نیک تمناؤں کے ساتھ دعائیں' پھول لے کر ہی جاتے ہیں۔" اللہ دتہ نے تمیزداری سے بتایا۔ "یہ عیادت کا سب سے خوب صورت طریقہ ہوتا ہے۔"

"کیا خوب صورت طریقہ ۔۔۔ نری فضول خرچی۔ مت ماری گئی ہے ساروں کی ۔۔۔ بندہ عیادت کے لیے جائے' کوئی سیب لے لے' کوئی آم کیلا ۔۔۔ مربہ۔ دودھ ڈبل روٹی' انڈے یہ پھول کیا سر میں مارنے ہیں۔ لو بھابھی ۔۔۔ یہ پھول تم لے جاؤ۔ تمہاری سمیرا کو اچھے لگتے ہیں یہ پھول شول ۔۔۔ شعروشیری ۔۔۔ گلاب ناں ۔۔۔" اور انکار کا موقع دیتی ہے تمہاری پھپھی بھولی ۔۔۔ پھول میری گود میں پھینک' پیر پٹختی چائے بنانے اندر چلی گئی۔ میں لے کر آگئی۔

بڑی امی کا لہجہ و انداز جتنا جلا کٹا تھا' ان تینوں کے قہقہے اتنے جان دار تھے۔ حمیرا حسب عادت دوہری ہو گئی تھی۔ ہنستے ہنستے صفیہ کی گود میں جا پڑی۔ بٹی ایسی بے ساختہ ہنسی ہنستی بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ اللہ اسے ایسے ہی شاد و آباد رکھے مگر اتنی بڑی کو گود میں کیسے گھسیٹ لیتی' بمشکل اس کا تربوز پیچھے دھکیلا۔

"واہ پھپھی بھولی ۔۔۔ تیرا بھی جواب نہیں۔" معید گھٹنے پر ہاتھ مار کے ہنس رہا تھا۔

"سمیرا نے پھولوں کو خود سے کچھ اور قریب کر لیا۔ خوشبو' ملائمت' احساس' اے ڈی ریاض۔

"السلام علیکم ۔۔۔!" یہ عبدالعزیز کی آواز تھی۔

"وعلیکم السلام ۔۔۔" سب چونکے۔ کورس میں

جواب آیا۔ صفیہ نے دوپٹا درست کیا۔ سمٹ کر بیٹھیں۔ سمیرا نے بکے خود سے لگائے لگائے باپ کو واسکٹ اتارنے میں مدد دی۔ پھر واسکٹ اپنے کندھے پر رکھ لی۔ حمیرا کی نگاہیں ان کے ہاتھ میں پکڑے شاپرز پر تھیں۔

"یہ کیا لائے ہیں؟"

"خود ہی دیکھ لو۔" وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

"پہلے پانی تو پوچھ لو' آتے ہی تفتیش۔" صفیہ نے ٹوکا۔

عبدالعزیز نے ہاتھ کے اشارے سے صفیہ کو کچھ نہ کہنے کی تادیب کی۔ حمیرا شاپر کھول چکی تھی۔ دو جوڑی سوفٹی... پھر یہ کہ دونوں ایک جیسی...

"دو کیوں لائے... معید تو دوسرے اسٹائل کی پسند کرتا ہے۔" بڑی امی نے شوہر کا منہ دیکھا۔

"یہ میرا نمبر بھی نہیں ہے۔" معید کا نمبر نو تھا۔ یہ دونوں گیارہ۔

"معید کی نہیں ہے۔" عبدالعزیز موزے اتارنے میں محو تھے۔ نگاہ اٹھا کر سب کو دیکھا۔

"ایک میری ہے اور دوسری۔" اب نظریں حمیرا پر تھیں۔ "دوسری حمیرا کی ہے۔"

"میری..." حمیرا کی حیرت بھری چیخ سب سے نمایاں تھی۔

"میری کیوں؟"

"تم ہی نے تو کہا تھا' تمہیں میری سوفٹی پسند ہے۔ اس لیے میں نے دونوں ایک جیسی لے لیں' کیوں پسند نہیں آئی۔"

"خاک پسند آئی ہے۔" حمیرا نے منہ پھلا کے ڈبا پرے کیا۔ "مجھے الگ سے سوفٹی نہیں لینی... مجھے تو وہی پہننی ہوتی ہے' جو آپ پہنتے ہیں۔"

"وہی..." اب حیران ہونے کی باری ان کی تھی۔

"کیوں؟"

"بس میری مرضی..." وہ بالکل خفا ہوگئی۔ ان کے اتارے موزے بوٹوں میں گھسیڑ کر اندر رکھنے چلی گئی۔ بند جاری تھی۔ تم میں نے کوئی فرمائش کی تھی' واپس کردیں۔ مجھے الگ سے نہیں لینی... اپنی پہننے نہیں دینا چاہتے تو صاف منع کردیتے۔ مجھے نہیں آئی پسند آپ کی یہ حرکت... صاف صاف بتا رہی ہوں ہاں...

واپس آکر پانی کا گلاس رکھتے ہوئے اس نے منہ بھی پھلا لیا تھا۔ عبدالعزیز سب کو پریشانی سے دیکھ رہے تھے۔ ایسا کون سا غلط کام کر آئے تھے۔ سوفٹی ہی تو...

"آپ نے تو کہا تھا' میری ہر چیز تمہاری ہے۔"

"مگر سوفٹی تو سب کی الگ ہوتی ہے۔" عبدالعزیز نے سب کو تائید طلب نگاہوں سے دیکھا۔

"جی نہیں... ہر چیز میں یہ بھی آتی ہے۔"

"مت بھولو' یہ ہمارے ابو ہیں..." حمیرا نے دو تین پھلیاں اٹھا کر اس کی جانب پھینکیں۔

"اوہ..." وہ دانت پیس کر پیچھے مڑی۔ "وہ تو ان کی مجبوری ہے۔"

"کیا مطلب...؟" سمیرا چونکی۔ معید کا منہ بھی کھل گیا۔

"بھئی' وہ تو ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ آپ کا بیٹا پیدا ہوا ہے۔ تو انہوں نے کہا' ٹھیک ہے اب ہوگیا ہے تو ہو گیا۔ مجھے تو تایا ابو نے خود پسند کرکے کہا۔ آج سے حمیرا میری بیٹی ہے۔ تم تو جیسے بھی ملے انہیں رکھنا پڑا۔ جبکہ مجھے انہوں نے چنا۔" اس نے گردن اکڑائی۔ معید اور سمیرا تو کیا خود عبدالعزیز کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"یعنی... یعنی کہ اف..."

بڑی امی ہنس پڑی تھیں۔ صفیہ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔ مگر وہ حیرت سے سوچ رہی تھیں کیسا مضبوط رشتہ بنا چکی تھی وہ اپنے تایا عبدالعزیز کے ساتھ۔

کیسا مان۔ غرور۔ لاڈ اور حق تھا۔

جبکہ وہ... وہ آج تک... ان کے اپنے اندر کی اجنبیت اتنے عرصے کے بعد بھی برقرار تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں ہمیشہ سے ایک قناعت پسند انسان رہا ہوں مگر

اب نجانے کیوں کبھی کبھی سوچتا ہوں' وہ فقیروں کی بادشاہوں کے لیے سات سات بیٹوں والی دعا درست ہی ہوتی تھی۔

"سات سات بیٹے....." اس نے بات کے الفاظ زیر لب دہرائے "کیوں؟"

"جب تمہیں اس حال میں دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں' ایک اور کندھا بھی ہونا چاہیے تھا۔" وہ اپنی سوچوں کے ہی زیر اثر تھے۔

"ہاں پھر آپ کو میرے لیے اتنی مشقت نہ اٹھانی پڑتی۔ ایک اور بیٹا ہوتا ناں۔" پتا نہیں وہ بدگمان ہوا تھا ....یا اس کا دل چھوٹا ہو گیا تھا۔

"کیا؟" وہ ایک دم سے چونک گئے۔ بیٹے کے الفاظ کو ذہن میں دہرایا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔ وہ مسکرا دیے۔

"ہاں ایک کندھا اور ہوتا جس پر سر رکھ کر میں اپنا دکھ بانٹ سکتا۔" ان کی آواز میں تھرتھراہٹ سی آ گئی۔ تو یہ پتا چلا' بے چارگی سے بھی بدگمانی بڑھتی ہے۔ اور اتنی جلدی معنی اخذ نہیں کرنے چاہئیں۔ اور یہ کہ اس نے کتنی جلدی سوچ لیا کہ باپ کے چھ بیٹے اور ہوتے تو اس کے لیے معذور ہو جانے والے بیٹے کو نظر انداز کرنا آسان ہو جاتا۔

"سوری ابو....!" وہ یہی کہہ سکا۔ ابو کی نگاہیں اس کی جانب اٹھیں۔ ان میں اٹھتا شکوہ معدوم ہو گیا تھا۔

"دل آزاری بھی گناہ اکبر ہے۔ معافی مانگ لینے سے دل ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔ معاف کر دینے سے.... معاف کر دینے سے دل.... دل نہیں رہتا اللہ کا گھر ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے گھر سے بڑھ کر جائے امان کہاں؟ جائے پناہ کون سی۔

"میں نے ایک بات سوچی ہے یار۔" ابو نے دوستانہ انداز سے اس کی پشت پر ہاتھ مارا۔ "تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو تمہاری شادی کروں گا۔"

"شادی!" وہ بری طرح چونکا۔ ابو کی شکل دیکھی۔ وہ کہیں پہنچے ہوئے تھے۔

"تم پھر جلدی جلدی چھ سات بچے پیدا کر لینا پھر ...." وہ کہتے جاتے تھے اس کی سوئی مین پوائنٹ پر رک گئی۔

"جلدی جلدی چھ سات بچے .... اکٹھے۔" وہ بھونچکا رہ گیا۔

"ارے یار!" ابو بدمزہ ہوئے۔ ابھی تو وہ شروع ہی ہوئے تھے "ٹوک دیا۔" "تو کتے نہیں ہیں۔" ابو کو شاید بچوں کو نظر لگ جانے کا اندیشہ تھا۔

"گھر میں ہلچل مچ جائے گی۔ چیاؤں پیاؤں۔ پوں پاں...." "ایک ادھر دوسرا ادھر۔"

"چیاؤں پیاؤں تو بلی کے بچے کرتے ہیں ابو....!"

"بلی کے....؟ تم نے پھر ٹوک دیا۔"

"میں نے تصحیح کی ہے ابو...."

"میں کب تم سے اصلاح لینے آیا تھا؟"

اس نے بھنویں اچکائیں اور ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ٹھیک ہے پھر جاری رکھیے.... اپنی چیاؤں پیاؤں۔"

"یار! انسان کے بچے بھی تو بلی کے بچوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔"

"بلی کے جیسے...." وہ پورا کا پورا ابو کی جانب گھوم گیا۔

"او ہو....!" ابو ہنس دیے۔ "میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو بس یہ کہہ رہا تھا' دونوں پیدا ہوتے ہیں تو لاچار ہوتے ہیں محتاج.... بند آنکھوں والے' بے بس.... پتا ہے' بلی اپنے نوزائیدہ کو منہ میں لے کر سات گھر بدلتی ہے۔"

"کیوں؟" اسے یہ بات پتا نہیں تھی۔

"حفاظت کے خیال سے.... مطمئن ہی نہیں ہوتی۔ ہر ایک پر شک کرتی ہے۔ ہر کوئی دشمن نظر آتا ہے اسے۔"

"تو پھر ایسا بلی کے ساتھ ہی کیوں؟ چڑیا بھی تو بے بال و پر بچوں کے لیے ایسے ہی مشقت سے دانہ دنکا لاتی ہے۔" اس نے بچپن میں کتنے درختوں کے اونچے تنوں پر چڑھ کر گھونسلوں کے اندر جھانکا لگائی تھی۔

"ہاں چڑیا بھی.... بلی کے بھی.... اور انسان کے تو لازمی.... گائے بکری کے بچوں کو دیکھا ہے؟ وہ پیدا

ہونے کے آدھے گھنٹے میں بیٹھنے، چلنے، بھاگنے کے مرحلے طے کر لیتے ہیں۔"

"ہاں، یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ قائل ہو گیا۔ "پتا نہیں ایسا کیوں ہے؟"

"مجھے پتا ہے۔" ابو کچھ تھک گئے تھے۔ دونوں آج پھر چلتے چلتے بہت دور نکل آئے تھے، وہ اب بغیر سہارے کے زیادہ چلتا تھا۔ حادثے نے دونوں کو قریب کر دیا تھا۔ پہلے اچھے باپ بیٹا تھے۔ مشفق باپ... فرماں بردار بیٹا... وہ اب دوست تھے۔

"میں اب چیزوں کو غور سے جانچنے لگا ہوں۔ ماہیت، تغیرات، وجوہ کیوں اور کیسے کے سوال و جواب۔"

"پھر کیا ملا؟" اس نے اسٹک پر دباؤ بڑھاتے ہوئے پیروں کا وزن منتقل کیا۔

"یہی کہ جن جانوروں کو انسان کی خوراک بننا ہو۔ وہ جلدی اور آسانی سے پروان چڑھتے ہیں۔ ان کی ماؤں کو کشٹ نہیں اٹھانے پڑتے۔ گائے بچہ دے کر فارغ۔ بچہ چند دنوں میں گھاس پر چلا جاتا ہے۔ سارا دودھ انسانوں کے لیے... عیش کرو۔"

ابو کی آنکھوں میں چمک نمودار ہو گئی تھی۔ اس کا حیران چہرہ دیکھ کر انہوں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"کیوں بھئی غلط کہا میں نے۔"

"نا۔ نہیں..." وہ چونکا۔ اس نے ان کا ہاتھ تھام کر اپنے ہاتھ میں گرمجوشی سے دبایا۔

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے... کمال ہے، میں نے کبھی ایسے نہیں سوچا۔" اسے افسوس ہونے لگا۔

"تو سوچا کرو بھئی... قدرت کے اسرار سمجھنا مشکل ہے، ناممکن نہیں... بس تیسری آنکھ کھولنے کی ضرورت ہے۔ لیکن انسان نے دو آنکھوں کو ہی سب سمجھ لیا ہے۔"

پتا نہیں ان کی آواز بھرا کیوں گئی تھی۔ شاید یہ خیال آیا تھا۔ وہ بھی تو دنیا کو دو آنکھوں ہی سے دیکھتے تھے۔ تاوقتیکہ...

"آپ تھک گئے ہیں ابو...؟"

"ہاں... باتوں میں پتا ہی نہیں چلا۔ ہم پھر بہت آگے تک آ گئے۔"

"نہیں..." اس کا لہجہ ہچکچایا ہوا تھا۔ "میری بیماری نے آپ کو تھکا دیا ہے۔"

ابو چونکے "پوچھ رہے ہو کہ بتا رہے ہو۔"

"جو آپ کو مناسب لگے۔" اس نے خود کو بری الذمہ کر دیا گیند ان کے کورٹ میں ڈال کر۔

ابو کی نظریں اس پر ٹک گئیں۔ "ایسی فضول باتیں سوچتے ہو۔"

"سوچوں پر اختیار نہیں ہوتا ابو..." اس کے لہجے میں بے بسی گھل گئی۔

"تمہارے جسم کی ٹوٹ پھوٹ سے زیادہ تکلیف مجھے تمہارے لہجے کی ٹوٹ پھوٹ سے ہوتی ہے بیٹے۔"

ابو دکھی ہو گئے تھے۔ وہ شرم سار ہو گیا۔ وہ یہی تو نہیں چاہتا تھا۔ وہ مزید دکھی ہیں۔

☆ ☆ ☆

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کسے قصوروار کہے امی کو... جنہوں نے اس کے ممکنہ موٹاپے میں مبتلا ہونے کے خدشے کے پیش نظر اسے بڑی امی کے ہمراہ بازار بھیجا تھا (کہ گھر سے نکلے گی، مہینے بھر کے راشن کے لیے دکان دکان گھومے گی۔ تھیلے اٹھائے گی تو کیلوریز برن ہوں گی۔ کچھ ایکسرسائز سے وزن بھی کم ہو سکتا ہے۔ چربی پگھلے گی) یا پھر خود کو کوسے۔ جس نے سامان کی لسٹ کھو دی تھی اور اب یادداشت کے زور پر سامان بمعہ قیمت لکھنے کی مصیبت میں گرفتار تھی۔

بڑی امی سارے اخراجات کا اندراج بڑے سلیقے سے ایک ڈائری میں کرتی تھیں اور بڑے بھروسے سے اسے لسٹ تھمائی تھی۔ وہ ذہین تھی مگر مسئلہ یہ تھا، کچن میں استعمال ہونے والے مسالوں وغیرہ کے نام نہیں آتے تھے۔ دالوں تک کو کلر کے حساب سے یاد رکھا تھا۔ پیلی والی (چنے کی) اور نبح دال (مسور کی)

"اف..." گھر میں داخل ہوتے معیذ نے اسے سر

پکڑے دیکھا تو نزدیک چلا آیا۔

"یہاں سب ظالم ہیں" اس کے پوچھنے کی دیر تھی۔ وہ تو بھری بیٹھی تھی۔ پھٹ پڑی "ایک ظالم میری اپنی خود کی ماں جس نے مجھے اس شاپنگ میں پھنسایا۔ آلو پیاز خریدنا بھی کوئی شاپنگ ہے۔ دوسری تمہاری امی جنہوں نے مجھے لسٹ پکڑائی اور اب کہتی ہیں۔ ڈائری میں سب لکھ کر بقایا پیسوں کا حساب کروں۔ اور ایک وہ لاڈلی سمیرا آپی ہوگی اپنے کمرے میں آرام کرسی پر دراز.... کوئی بک ہاتھ میں ہوگی مطالعہ سے شوق فرمایا جارہا ہوگا اور ادھر میں...."

"آپی امی کے پیروں پر مالش کر رہی ہیں۔" معید نے گردن اچکا کر دیکھا۔ کھڑکی سے اندر کا منظر دکھائی دیتا تھا۔

"اوہ...." اس نے اپنے پیر دیکھے۔ دھوئے تک نہیں تھے۔ تھکن ہی اتنی تھی۔

"مالش کی ضرورت تو میرے پیروں کو بھی ہے۔"

"تم آپی سے مالش کروانے کا کہہ رہی ہو؟" معید اپنی بہن کا احترام کرتا تھا۔ یہی شروع دن سے نام سے پکارتی تھی۔ حالانکہ معید سے بھی چھوٹی تھی۔

"ہاں۔" اس نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔

"تم کوئی آسمان سے اتری ہو جو آپی تمہارے پیر دبائیں گی۔"

"ہاں!" اس کا انداز بے نیاز ہوا۔ "میرے ابو کہتے تھے، مجھے آسمانوں سے گلابی پری انہیں دے گئی تھی۔" وہ پیارا سا مسکرائی۔

"اوہ...." معید نے بے ساختہ اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "والدین بچوں کو ایسے ہی بہلایا کرتے ہیں۔ تم نے یقین کرلیا۔"

خود پر فخر کرتی وہ بری طرح چونکی اسے گھورا۔

"اپنی شکل دیکھی ہے۔"

"ہاں الحمدللہ...." وہ بے پروا تھا۔

"تم جاؤ یہاں سے۔ مجھے حساب لکھنے دو۔" وہ کٹھور ہو گئی رخ بدل لیا۔

"میں تمہاری ہیلپ کرسکتا ہوں۔"

"ضرورت نہیں.... جب میری اپنی ماں مجھے ایسے کاموں میں پھنسا کر چلی گئی تو اب کس سے فریاد کروں یہاں کوئی میرا نہیں۔ اتنی ناانصافی...." اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر دہائی دی۔

"کیسی ناانصافی....؟"

"دیکھو شام ٹھنڈی ہے۔ اس ہلکے اندھیرے میں میں اکیلی تن تنہا صحن میں بیٹھی ہوں۔ اودھر سامنے دادا کے زمانے کے درخت کھڑے ہیں۔ ان پر سایہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور بڑی امی مجھے ان حسابوں میں لگا کر خود اپنی پیاری بیٹی کے ساتھ اندر مالش کے مزے لے رہی ہیں۔ یتیم ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ مجھے انسان ہی نہ سمجھا جائے۔ میں ادھر ٹھنڈ میں کانپ رہی ہوں اور ادھر...." اس نے کپکپانا شروع کردیا۔ دانت بھی بج رہے تھے۔

کوئی اور ہوتا تو اس دل گیر انداز و بیان اور رقت پر کندھا پیش کر دیتا مگر سامنے بھی معید تھا۔ اس نے دانت پیس کر اسے دیکھا اور تائیدی انداز سے بیان جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔

"مانا کہ تایا ابو کے مجھ یتیم پر بڑے احسانات ہیں۔" اس نے ہچکی بھری اور معید کو دیکھا۔ معید نے اثبات میں سر ہلا کر اسے گھورا۔

"احسان فراموش نڈر لڑکی....!"

"مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ مجھ سے اتنے بڑے بڑے حسابات کروائے جائیں۔"

"حسابات؟" معید چونکا۔ "ایکسوزمی یہ کسی ملک کے خزانے کا حساب نہیں ہے۔ چند افراد پر مشتمل ایک چھوٹے سے خاندان کے ننھے سے کچن کی بنیادی ضرورتوں کی چیزیں ہیں۔ زیرہ اور دھنیا اور کالے کالے دانے۔" معید کی نظریں ان ہی لفظوں سے ٹکرائیں "یہ کالے کالے دانے کیا ہیں؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"کلونجی ہوگی بے وقوف۔" معید نے کہا۔

"اوہ ہاں.... ہاں ہاں بالکل۔" حمیرا نے فوراً تصحیح کی۔

"ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی؟"

"کسی ناانصافی کا ذکر تھا۔ ٹھنڈی شام.... گرم کمرے وغیرہ۔"

"ہاں.... وہی تو.... اگر مجھے ٹھنڈ لگ جائے تو میری بیوہ ماں کہاں کہاں لے کر گھومے گی مجھے اس عمر میں۔"

"گھومنے کی کیا ضرورت ہے، ہم تمہیں ان ہی دادا ابو کے زمانے کے درختوں کے سائے میں گاڑ دیں گے۔ قبر پر دیا جلانے کی مشقت سے بھی جان چھوٹے گی، وہاں آل ریڈی بلب موجود ہے۔" آخر معید اتنی الزام تراشیاں کب تک برداشت کرتا۔

"میرے بعد میری ماں کا کیا ہوگا معید....؟"

"وہ سکھ کا سانس لے گی۔ تمہارے جیسی نکمی اولاد کے والدین ہی ہوتے ہیں جن کے بارے میں ماں کہتی ہے۔" ہائے جے مینوں پتا ہوندا توں اے ہو جئی نکلیں گی جمدے ہی ساہ گھٹ دیندی۔"

"کیا....؟" حمیرا نے ڈائری پٹخی۔ "تم میرے بارے میں ایسا کیسے کہہ سکتے ہو۔"

"میں نہیں کہتا، تمہاری امی کہتیں۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، تم اپنے اندر کی جلن نکال رہے ہو.... میں ابھی تایا ابو کو بتاتی ہوں۔" اس نے پیر پٹخے۔

"اچھا جی۔ تم جو مرضی کہتی رہو اور ہم سچ بھی نہ بولیں۔"

"یہ سچ تھا؟"

"دسمبر کے مہینے میں ٹھنڈی شام...." اس نے دانت کچکچائے "یتیم بھتیجی پر ظلم۔ ارے تمہارے لاڈ اپنے باپ کے ہاتھوں دیکھ دیکھ کر تو کبھی کبھی مجھے لگتا ہے یتیم تم نہیں میں ہوں اور وہ جو تم...."

"معید....!" ڈھیٹ پن سے مسکرا کر سنتی حمیرا نے بری طرح چونک کر ٹوکا۔ "دوبارہ یہ بات مت کہنا۔"

"کون سی بات....؟" معید کو ٹوکے جانا پسند نہیں آیا تھا۔

"یہ کہ تم یتیم ہو.... خدانخواستہ تایا ابو کو میری عمر لگ جائے۔ انہیں گرم ہوا نہ چھوئے۔ یتیمی سے بڑا دکھ کوئی اور نہیں ہوتا اور یہ بات مجھ سے بہتر اور کوئی نہیں جانتا۔"

وہ جو کچھ دیر پہلے کی اداکاری تھی۔ معید کو چڑانے کی کوشش.... وہ شریر انداز سب غائب ہوگیا۔ اس کا چہرہ غم کی تصویر بن گیا۔ خاموشی اور ملال.... آنکھوں کی جوت بجھ گئی۔

"میں مذاق کر رہا تھا حمیرا! ابو سب سے زیادہ پیار تم سے کرتے ہیں۔ آپی اور مجھ سے بھی زیادہ.... اور ہم سب نے کبھی تم سے کوئی زیادتی نہیں ہونے دی۔ ہم سب چچا جان جتنا پیار یقیناً" نہیں کر سکتے۔ مگر کوشش ضرور کرتے ہیں۔ اگر ابو ابھی تمہارا یہ ٹوٹا لہجہ سن لیں تو اندازہ ہے ان کو کتنی تکلیف ہوگی۔ تمہیں کوئی شکایت ہے تو کہو۔"

"مجھے کوئی شکایت نہیں۔" حمیرا نے اپنا لہجہ بشاش کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں.... تم ایسے بھی نہیں بولیں۔ آج یتیمی کیوں یاد آ گئی۔ ابھی تو ساری زبان کی دھار مجھ پر استعمال کر رہی تھیں۔ میں جواب دینے لگا تو ابو کو شنل بلیک میلنگ پر آ کر میرا منہ بند کروانے کا حربہ تھا ناں یہ۔"

معید نے مسکرا اسے دیکھا۔

حمیرا نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں معید! مجھے آج واقعی ابو یاد آ رہے تھے۔"

"سوال یہی ہے کیوں؟"

"ٹریفک جام میں پھنس گئے تھے آج ہم.... میں اور بڑی امی.... جب بازار گئے تو...."

"ہاں ہاں آگے بولو...." معید کو یکدم کچھ اندازہ ہوا۔

"وہاں.... ابو کی گاڑی بھی کھڑی تھی۔"

"اوہ....!" معید نے سارا معاملہ سمجھ لیا۔ حمیرا کے ابو کے انتقال کے بعد ان کے قرض کا بوجھ اتارنے کے لیے معید کے ابو عبدالعزیز نے ان کی ہائی ایس وین بیچ دی تھی۔ مرحوم بھائی کا قرضہ اتارنا بہت

ضروری تھا۔ حمیرا کی ذہن سے جذباتی وابستگی تھی جب
ابو نے وہ گاڑی خریدی تھی سب سے پہلے حمیرا کو آگے
بٹھایا تھا اور پھر وہ اسے اسکول چھوڑتے تھے۔ سات
سال کا عرصہ گزر گیا۔ وہ گیارہ برس سے اٹھارہ برس میں
آگئی۔ مگر ابو کی ہائی ایس جب بھی دیکھ لیتی' اس کی
حالت ایسی ہی ہو جاتی تھی۔ ہنستے مسکراتے ہوئے
سب کے درمیان رہتے ہوئے بھی کچھ نہ کچھ ایسا کہہ
جاتی جو گھر کے ہر فرد کو بتا دیتا۔

"آج کچھ ہوا ہے۔"

تو وہ جو سامان کی لسٹ کہیں گرا دی اور حساب
کرنے میں جو جھنجلاہٹ تھی۔ ساری لن ترانیاں
اسے کم کرنے کی کوشش تھی۔ وہ جو کہاں کے قصے
کہاں جوڑ رہی تھی۔ ہوتا ہے ایسا بھی۔ کبھی کبھی
انسان بہت سارا فضول بول کر اندر کی گفتگو کے شور کو
کم کرنا چاہتا ہے۔

زندگی کے امتحانی پرچے کا ہر سوال حل کرنا پڑتا
ہے۔

مگر بعض دفعہ خالی جگہ پر کرنے والے سوال کے
لیے کوئی لفظ موزوں نہیں ہو پاتا' یہاں تک کہ زندگی
ختم ہو جاتی ہے۔

نصاب کی کتاب میں مترادف جملے ہوتے ہیں۔

مگر زندگی کی کتاب میں ماں اور باپ کے بعد دوسرا
لفظ' دوسرا رشتہ کوئی نہیں ہوتا۔ جہاں باپ لکھنا ہو
وہاں اور دوسرا کوئی نام نہیں لکھا جا سکتا۔

"میں ایسے ہی تمہیں تنگ کر رہی تھی معید۔۔۔!"

حمیرا نے سر جھٹک کر جیسے ساری کیفیت سے چھٹکارا
پانے کی کوشش کی' تب دیکھا معید سر نیہوڑائے مجرم
سا بیٹھا ہے۔

"کیا بات ہے' تم دونوں اتنی دیر سے کون سی
کہانیاں کہہ رہے ہو۔" سمیرا تیل کی شیشی لیے غسل
خانے کی طرف جا رہی تھی۔

"اور حمیرا۔۔۔ امی ڈائری مانگ رہی ہیں۔"

"ہاں پتا ہے مجھے۔۔۔ خود اپنی بیٹی کو تو کچھ کہتیں
نہیں مجھ سے ہی کام کرواتی ہیں۔"

"وہ نہیں کروا رہیں۔۔۔ تمہاری امی ہی نے کہا ہے۔
پیاری حمیرا امتحان دے کر فارغ ہے' اسے کسی کام
سے لگایا جائے۔"

"تو کیا یہ ضروری ہے کہ مجھے راشن خریدنا سکھایا
جائے۔" "میرا کام گھر چلانا ہے' راشن خریدنا مردوں کا
کام ہے۔"

"ہو سکتا ہے' تمہیں کوئی نکھٹو مل جائے۔" معید
نے ٹکڑا لگایا۔

"ہاں تمہارے جیسا۔۔۔" ترنت جواب دیا مگر اگلے
ہی پل معید کے پھیکے پڑتے چہرے کو دیکھ کر زبان
دانتوں تلے دابی۔

"سوری۔ میں نے تمہیں نہیں کہا تھا۔"

"ہاں تو میں نے کب کہا' تم مجھے کہہ رہی ہو۔"
معید مسکرایا۔ چہرہ رنگین ہو گیا۔

حمیرا نے پرسکون سانس لی۔ ایک بات طے ہے۔
سوچ سمجھ کر اور گردو دیکھ کر بات کرنی چاہیے۔ اس نے
سمیرا کو دیکھا۔ بالکل لکس کے اشتہار کے انداز میں
گالوں پر جھاگ مل رہی تھی۔

"میں تمہیں لسٹ بنا دوں گا۔" معید نے چپکے
سے کہا۔

"تم کیسے۔۔۔؟"

"یار! سارا راشن ابھی تھیلیوں میں ہی پڑا ہے۔ تم
مجھے دکھاتی جانا میں تمہیں بتا دوں گا۔"

"مجھے قیمتیں یاد ہیں۔" حمیرا کا لہجہ مزید دھیما ہوا۔

"مگر جو چیزیں تمہاری امی نے خریدی ہیں ناں' ان کے
نام نہیں آتے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ بڑی امی
نے کچن سنبھالنا ہے کہ پنساری کی دکان کھولنی ہے؟"

"میری امی کی برائیاں کرنی ہیں۔ اس کا مطلب ہے
تمہیں مسئلہ حل نہیں کروانا۔" معید ہنستے ہنستے سے
اکھڑا۔ "بڑی امی کے سامنے جی امی۔۔۔ جی امی اور اکیلے
میں تمہاری امی۔" "یہ ساری شکایتیں تم امی کے سامنے
کیوں نہیں کرتیں ڈرتی ہو؟"

"میں کسی کے باپ سے بھی نہیں ڈرتی معید۔۔۔
مگر تمہاری امی میری امی کو بتا دیتی ہیں۔" اس نے

ہونٹ لٹکائے۔

"اوہو..." معید ہنس دیا۔ "یعنی جو کسی کے باپ سے بھی نہ ڈرے وہ اپنی ماں سے تو ڈرتا ہی ہے۔"

"ماؤں سے ڈرنے میں کوئی حرج نہیں۔" اس نے عالمانہ انداز اپنایا کیونکہ امی کی پٹی لگتی بڑے زور کی ہے۔"

معید زور سے ہنسا۔

"تم ہنسو... تمہیں کبھی پڑیں نہیں ناں...

حمیرا کو یہ دکھ بھی بروقت یاد آیا۔

"اویار...!" معید جگہ سے اٹھا۔ "ہمیں جتنی پڑنا تھیں ایک بار ہی پڑ چکی ہیں۔"

حمیرا نے نظریں اٹھا کر بے ساختہ اسے دیکھا۔ بیسن کے سامنے لگے آئینے میں سمیرا کا جھاگ سے چھپا چہرہ تھا۔ اس نے بھی معید کے جملے پر چونک کر ہاتھ روک دیے تھے۔ معید اپنی کہہ کر اب مسکرا رہا تھا۔

حمیرا کی آنکھوں میں تنبیہہ ابھری۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کوئی تسلی، دلاسا، بہلاوا، جھوٹ بعض دفعہ خوب صورت نام بھی اپنا لیتا ہے۔"

"اوں ہوں۔" معید نے انگلی اٹھائی۔ "چلو کچن میں... امی اونگھنے لگی ہیں۔ اور چچی جان بھی آتی ہوں گی۔ ان کے آنے سے پہلے ہی..."

حمیرا نے کچھ بھی کہنے کا ارادہ بدل دیا۔ اس کے پیچھے کچن تک چلی آئی۔ اور جس کام کو بہت مشکل سمجھ رہی تھی۔ وہ اس کی ہمراہی میں منٹوں میں نبٹ گیا۔

"کیا فائدہ... امی کل مجھے پھر کسی کام میں پھنسا دیں گی۔ پورے گھر میں جھاڑو پھروا کر سکون نہ ملا تو اب چھت کی صفائی کا حکم بھی دے دیا ہے۔ ہفتے میں دوبار۔" اسے نیا دکھ یاد آیا۔ "کچھ ایسا کرو میں امی کو ہر وقت کام کرتی نظر آؤں۔"

"تو کام ہی کر لیا کرو۔" معید نے مزے سے کہا۔

"تم سب لوگ آپس میں ملے ہوئے ہو معید...!"

وہ منہ پھیر کر ناراض ہو گئی۔ چنگیر کے نیچے ڈائجسٹ اوندھا پڑا تھا۔ اسے اٹھا لیا۔

"تم کہانیاں لکھنے لگو..." معید نے کہا۔

"پڑھنے امی دیتی نہیں ہیں۔ لکھنے دیں گی۔" اسے آئیڈیا بالکل نہیں بھایا۔

"اویار... انہیں کیا پتا چلے گا۔ انہیں تو تم بس پڑھتی لکھتی دکھائی دوگی۔ ہاں۔"

"گڈ آئیڈیا۔ مگر کہانی کہاں سے لوں...؟"

"یہ مسئلہ ہے۔" معید سوچ میں پڑ گیا۔

"اپنی ہی لکھ لو۔"

"اپنی کہانی... میری بھلا کیا کہانی..." حمیرا نے ہونق پن سے کہا۔

"وہی... جو مجھے ابھی سنا رہی تھیں ایک بے بس یتیم لڑکی... اپنی تائی کے ظلم سہتے ہوئے۔" معید نے کہنا شروع کیا۔ ساتھ ہی اس کی نظریں حمیرا کے بے یقین کھلتے منہ پر تھیں۔

"تایا کی بے اعتنائی۔"

"کیا؟" یہ سراسر الزام تھا۔ جھوٹ تھا اور گناہ تھا ایسا سوچنا۔ حمیرا نے فوراً ٹوکنا چاہا۔ پر معید نے ہاتھ اٹھایا۔

"کہانی کے ہائی پوائنٹس دے رہا ہوں۔ چپ چاپ نوٹ کرو۔"

"بے چاری بچا کھچا کھاتی ہے اور سارے گھر کے کام بھی کرتی ہے۔"

"ہائیں کب...؟ ابھی دوپہر ہی میں تو جمبو برگر بڑی امی نے کھلایا تھا اور گھر کے لیے شوارما لے کر دیا تھا۔ 250 ایم ایل کی ایک کولڈ ڈرنک بھی چھپا کر رکھنے کی ہدایت کے ساتھ لے دی تھی (حمیرا کی امی کو اس کے موٹاپے کی بڑی فکر رہتی تھی۔ ان کا بس چلتا تو اس کا کھانا پینا بھی بند کر دیتیں)

سارے گھر کے کاموں کا ذمہ بھی امی ہی کی خواہش تھی۔

"بے چاری کے سارے کپڑے پھٹ چکے ہیں۔ پیوند لگا کر پہننا چاہتی ہے تو سوئی تک نہیں ہے۔" معید نے نجانے کب دیکھ رکھا تھا۔ حمیرا نے خود کو دیکھا۔ وہ

اس وقت لان کے ڈیزائنر سوٹ میں ملبوس تھی۔ جو بڑی امی نے خود خرید اتھا۔

"تایا کے بچے اسے مارتے ہیں' اس کی چیزیں چھین کے بھاگ جاتے ہیں۔" معید کی زبان مسلسل چل رہی تھی۔

"کب؟"

"برتن بھانڈے دھونے سے اس کے ہاتھ لکڑی کے ہو چکے ہیں' ناخن ٹوٹے ہوئے۔ بے چاری چھپ چھپ کے روتی ہے کیونکہ تایا کے بدتمیز بچے اور ظالم تائی اسے سب کے سامنے خود پر ہوئے مظالم ظاہر نہ کرنے دینا چاہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ۔"

معید کے چہرے پر ہنسی چمکی۔ اسے کوئی اور جملہ سوجھا تھا۔ مگر حمیرا کا ضبط ختم ہو گیا۔

"معید کے بچے' تم کتنے بڑے جھوٹے ہو۔ اتنی لمبی کہانی بن لی کھڑے کھڑے... اللہ نہ کرے جو میرے تایا ایسا کریں۔ وہ تو مجھ پر جان چھڑکتے ہیں۔ وہ تو میری خاطر۔"

حمیرا شروع ہو گئی۔

"تم دوسری کہانی لکھ سکتی ہو۔" معید نے ہاتھ اٹھایا۔

"ایک تایا... جو اپنی یتیم بھتیجی کے لاڈ میں آکر اپنی بیوی بچوں سے زیادتی کرتے ہیں اور۔"

"ہاں..." حمیرا نے کھلے منہ پر ہاتھ رکھا۔ "تم کتنے بڑے جھوٹے' مکار اور ڈرامے باز ہو معید... میں تایا ابا کو بتاتی ہوں۔ صبر کرو۔"

وہ کچن سے باہر بھاگی۔ معید کی ہنسی بھرپور تھی۔

☆ ☆ ☆

امی نجانے دودھ میں کیا گھول کر لائی تھیں اور اسے پلانے پر مصر۔ ابھی تو دیسی گھی والی روٹیوں کے ساتھ دیسی بھنے مرغ کا ذائقہ بھی لبوں سے چپکا ہوا تھا' اوپر سے یہ مزید ستم... وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر امی نے پیش بندی کے طور پر پہلے ہی چہرے کے تاثرات سخت کر رکھے تھے۔ ناراضی اور الجھن بھی نمایاں تھی۔

اس نے مدد طلب نگاہ سے ابو کو دیکھا' وہی کوئی راہ سجھائیں۔ مگر وہ اسے آنکھ بند کر کے پی لینے کا مشورہ دے کر باقاعدہ منہ پھیر کے بیٹھ گئے یہ اشارہ تھا' وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔ امی' باپ بیٹے کے اشاروں کی زبان کے معنی بخوبی سمجھ رہی تھیں۔ مگر دودھ کا گلاس والا ہاتھ اس کی طرف بڑھا ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے' لائیے..." اس نے ہاتھ بڑھا کر دودھ پکڑ لیا مگر امی واپس جانے کے بجائے وہیں کھڑی تھیں۔

"ابھی پیو..." وہ قطعیت سے بولیں۔

"سوتے وقت پی لوں گا امی..." اس نے درخواست کی۔

"نہیں۔ سوتے وقت تو میں نے تمہیں دو چمچ پسے بادام دینے ہوتے ہیں۔"

"امی..." اس کی آواز میں اس بار مدد کی پکار تھی۔ اور ابو تو پہلے ہی اجنبی بنے بیٹھے تھے۔ اوپر سے امی کے پتھریلے تاثرات۔ اس نے گلاس ہونٹوں سے لگا لیا اور ایک سانس میں چڑھا گیا۔ امی کو آرام سے کہنے کی مہلت بھی نہیں دی۔

امی کا چہرہ مطمئن ہو گیا وہ کھڑا ہو گیا۔

"اب کہاں جا رہے ہو؟" امی نے تیزی سے پوچھا۔

"وہ ٹہلنے..." اس کے منہ سے بمشکل نکلا' وجہ ڈکار تھی۔ وہ سخت بدمزہ ہو کر دروازے سے نکل گیا۔ پر امی پر اس ناراضی کا اثر نہیں ہوا' ان کا کام ہو گیا تھا ان کے تاثرات مطمئن سے زیادہ فاتحانہ تھے۔ گلاس اٹھا کر جانے لگیں۔ شوہر سے نظر ٹکرا گئی۔

"یہ زیادتی ہے۔"

"کوئی زیادتی نہیں ہے۔" وہ ان کا اشارہ سمجھ گئیں۔ گلاس واپس رکھ دیا۔ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔ "الحمد للہ بہت ریکور کر لیا۔ اب تو اسٹک بھی چھوٹ گئی ہے مگر جسم جان کیوں نہیں پکڑ رہا۔" ان کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ انہیں مورد الزام ٹھہرا رہی ہوں۔

"تم نے اسے پہلوان بنانا ہے؟" انہوں نے

سرسری لہجہ اپنایا۔
"نہیں۔" وہ چڑ گئیں "بات پہلوان کی نہیں ہے۔ یاد نہیں کیسا کسرتی جسم تھا' باڈی بلڈنگ کرتا تھا۔ یہ گوشت سے پر شانے۔ چوڑا سینہ' گالوں سے خون ٹپکتا تھا۔ یہ اونچا لمبا شیر جوان... اور اب صرف لمبا رہ گیا ہے۔ اس کے اپنے کپڑے مانگے کے کپڑے لگتے ہیں جسم پر صرف کھال ہے جو ہڈیوں پر منڈھی لگتی ہے۔ کپڑے جھولتے ہیں' جوتے کا سائز تک کم ہو گیا ہے۔ بیٹھ کر ہڈیاں گن لو بس..."
"یہ سب مجھے بتا رہی ہو... کیا مجھے نظر نہیں آتا؟" انہوں نے سوال کیا۔
امی کی بولتی بند ہو گئی۔ یہاں وہ کسے سنا رہی تھیں۔
"ہاں وہ ایسا نہیں تھا۔ مگر یہ کیوں نہیں سوچتیں... کہ وہ ہے۔ ہم دونوں کے بیچ جیتا جاگتا... کیا یہ کافی نہیں ہے؟" وہ انہیں کچھ یاد کروا رہے تھے۔
وہ حادثے کی دوپہر۔ وہ زندگی کے ختم ہو جانے کا یقین... جیسے سینے سے سانسیں نکل جائیں۔ اس نے پینٹ شرٹ پہننی چھوڑ دی تھی۔ کہتا عجیب لگتا ہے۔"
"تو تم اب زور مت دینا۔"
"وہ بہت پتلا ہو گیا ہے۔"
"یہ سب باتیں میں جانتا ہوں ناہید۔"
"تو اسی لیے تو میں اس کی صحت بنانا چاہتی ہوں۔ صحت بخش غذا کھائے گا تو جسم پر بوٹی چڑھے گی ناں۔"
انہوں نے بھی اصل سبب بتانا ضروری سمجھا۔
"تو صحت بخش طریقے ہی سے کھلاؤ ناں۔" وہ مسکرائے۔ "ایسے ٹھونسنے کا کیا طریقہ ہے۔"
رات بستر میں چھپ کر شوارما کھاتے اور کولڈ ڈرنک پیتے بڑا مزہ آ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ معید کی باتیں یاد آ رہی تھیں تو ہنسی بھی آ رہی تھی۔
"توبہ... کتنی آسانی سے اتنے سارے جھوٹ گھڑ لیے۔ وہ بھی دو مختلف نوعیت کے جھوٹ... اور کہتا ہے' اس پر کہانی لکھ لوں۔ میں کوئی پاگل ہوں جو اتنا سارا جھوٹ لکھ دوں۔ نرا گناہ۔ مجھے لکھنا ہی ہو گا تو سچ

کیوں نہ لکھوں۔ ایک بالکل سچی سی سیدھی سادی کہانی... کہتا ہے تایا تائی ظلم کرتے ہیں۔ بچی مجبور و بے کس ہوں۔" اسے زور سے ہنسی آئی۔
"کس بات پر ہنسی آ رہی ہے حمیرا۔" امی کی نیند میں ڈوبی آواز ابھری۔
حمیرا بری طرح چونکی "ہنس تو نہیں رہی' میں کھانس رہی ہوں امی۔ آکھوں... آکھوں... ہوں۔"
"یا اللہ!" امی نے دانت کچکچائے تھے۔ "جس لڑکی کو کھانسنے کی تمیز نہ ہو۔ اس سے اور کیا امید رکھی جا سکتی ہے۔ اب اٹھ کر پانی پی لو۔"
"جی... جی پی رہی ہوں۔" اس نے اسٹرا سے ایک لمبا گھونٹ کھینچا۔
"بستر میں لیٹے لیٹے کیسے پی لیا پانی۔" امی کے نقطہ اعتراض میں کتنا دم تھا۔
"میرا مطلب ہے' پینے لگی ہوں۔"
"ارے بستر پر جے جے... کیسے پینے لگی ہوں۔ اب یہ خواہش ہو گی' پانی بھی ماں ہی اٹھ کر دے دے۔" امی اٹھنے لگی تھیں کیا۔
"ارے نہیں..." حمیرا اچھل کر بیٹھی۔ "میں لے رہی ہوں امی آپ تکلیف نہ کریں۔" اس سے پہلے کہ وہ اٹھ جاتیں اور اس کے نزدیک آ جاتیں اور کوک اور شوارما نظروں میں آ جاتا... او خدا... ایسے برے وقت سے پہلے ہی اٹھ جانا بہتر تھا اور تھوڑی دیر پہلے ہی جب امی نماز کے بعد تسبیح لیے چارپائی پر آئیں اور آنکھیں بند کر کے ورد کرنے لگیں تب یکدم انہوں نے ناک چڑھا کر جیسے کچھ محسوس کرنا شروع کر دیا۔
"کیا ہوا امی؟" اس نے شوارما کے بڑے نوالے کو تیزی سے نگلا۔ ہونٹوں پر ہاتھ بھی پھیر لیا۔
"خوشبو سی آ رہی ہے۔"
"ہاں...!" حمیرا تکیے سے لپٹ سی گئی۔ مسحور ہو گئی ہو جیسے "رات کی رانی کی ہے۔"
"یہ پھول پتیوں کی خوشبو نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے' نان کی خوشبو ہے یا برگر یا پھر..."
"اوہ...!" اس نے فوراً حیرت کا اظہار کیا۔ نان یا

بر گریباں کہاں....

"ہے بھئی..." امی تسبیح چھوڑ کر کھڑی ہونے لگیں "دار چینی کی تیز اسمیل ہے۔"

"وہ امی!" حمیرا نے اپنا تکیہ درست کیا۔ شوارما تو چھپ گیا تھا۔ بوتل کا کیا کرے۔ ڈھکن بھی نہ جانے کہاں چھپ گیا اور امی سر پر پہنچنے والی تھیں۔

"مجھے لگتا ہے امی... یہ معید ہے۔ چھپ کر کچھ کھا رہا ہے۔"

"تو اسے بھلا چھپ کے کھانے کی کیا ضرورت..."

"وہ بڑی امی کہتی ہیں نا... صحت مند غذائیت بخش کھانے کھانے کو..."

"اوہ...!" امی فوراً پرسکون ہو گئیں... واپس جگہ پر چلی گئیں۔ ان کی نگاہیں کھلی کھڑکی پر جم گئی تھیں۔

"ماں سے چھپ کر کوئی کام نہیں کرنا چاہیے۔" امی اپنا تکیہ درست کر رہی تھیں۔

"جی ہے.. تو آپ نے بالکل صحیح کہا۔" حمیرا نے اپنے تکیے کے نیچے سے شوارما نکالا۔ ایک بڑا لقمہ کاٹا... ہم...

"سوری معید...!" اس نے کروٹ بدلی۔ اب خطرہ ٹل گیا تھا۔ "میں نے تم پر سارا الزام دھر دیا مگر تم فکر نہ کرو۔ امی نے کون سا تمہاری شکایت بڑی امی سے لگا دینی ہے۔ امی ویسے بھی کم بولتی ہیں۔ شکایت کا تو سوال ہی نہیں اور دوسرے اگر بتا بھی دیں گی تو بڑی امی کو تو پتا ہے نا... شوارما انہوں نے مجھے لے کر دیا تھا اور میں..." وہ ہنسی... "میں کھانے کی چیز کسی کو بھی نہیں دیتی اور یہ بھی سچ ہے کہ تمہارے اس گھر سے مجھے ہمیشہ ملا ہی ہے۔ دینے کی نوبت ہی نہیں آئی اور یہ بھی ہے کہ میرے پاس ہے ہی کیا؟ کچھ بھی تو نہیں... یہ چھت... یہ بستر... یہ زمین... یہ لباس... میرے چاروں طرف میری خود کی خریدی کوئی چیز نہیں ہے۔ سب تایا ابو کی خریدی ہوئی چیزیں... وہ چیزیں جو انہوں نے میرے لیے محبت سے لیں... ہاں صرف ایک میرا وجود ہے یہ جسم... اس پر ملکیت کا حق میرا ہے لیکن احسانات اور تشکر کا احساس ذہن و دل پر غالب ہو تب جسم بھی پرایا ہو جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے' میں تم سب لوگوں کی محبت کی قرض دار ہوں۔ جسم کا رواں رواں قرض میں جکڑا ہوا ہے مگر یہ جکڑ تکلیف دہ نہیں ہے۔ بعض دفعہ ہم خود... خود کو پیش کر دیتے ہیں' کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان محبتوں کا احسان اتار نہیں سکتی۔

مگر احسان اتارنا ضروری بھی نہیں۔ فقط احسان کا احساس بھی کافی ہوتا ہے۔ یہ احساس انسان کے ضمیر کو زندہ رکھتا ہے اور ضمیر کی زندگی شاید جسم کی زندگی سے بھی زیادہ ضروری ہوتی ہے۔

میں حال میں جیتی ہوں۔ مستقبل کی اچھی امید کے ساتھ... مگر ہر شخص کا ایک ماضی بھی تو ہوتا ہے نا... اچھا یا برا!...

برا تو نہیں تھا' بہت اچھا تھا... سب کچھ بہت اچھا تھا... وہ... امی... ابو... تکون کے تین کونے... مگر ایک کونہ ٹوٹ گیا... زندگی کی شکل بگڑ گئی۔

کرائے کا گھر تھا۔ اسے پہلی بار پتا لگا۔ گھر میں رہنے کے پیسے بھی دینے ہوتے ہیں۔

"یہ تو ہمارا گھر ہے امی! تو یہ انکل کس بات کے پیسے مانگ رہے ہیں۔" وہ کبھی ماں کا چہرہ دیکھتی تھی۔ کبھی مالک مکان کا...

جو کہہ رہا تھا۔

"میں بھی غریب آدمی ہوں۔ بہن... گھر کو آدھا کر کے پورشن اس لیے بنایا تھا کہ خرچ میں کچھ سہولت ہو۔ بچے پڑھانے ہیں... آپ کو تو سب پتا ہے نا۔"

"مجھے کچھ دن کی مہلت دیجیے۔" امی نے چہرہ آڑ میں کر رکھا تھا۔ نظریں زمین پر گڑی تھیں۔

مالک مکان جو کل تک اس کے دوستوں کے ابو تھے۔ آج اسے کتنے برے لگنے لگے تھے۔ جن کے جانے کے بعد امی ساری رات روتی رہیں۔ پھر پتا نہیں امی نے کہاں سے انہیں کرایہ ادا کر دیا۔ وہ شکریہ ادا کر کے چلتے بنے۔

وہ گیارہ برس کی بچی تھی... نہ بہت چھوٹی نہ بہت بڑی...

مگر عمر بھی ہر کسی پر اپنے انداز سے جھلکتی ہے۔
مزدور پیشہ غریب بچے۔ گیارہ سال میں گیارہ صدیاں جی لیتا ہے۔ مفکر، مدبر سب ہو جاتا ہے۔
بے حس دنیا کو میلی آنکھ سے دیکھتا ہے اور بے رحمی کے ڈنڈے سے کوستا ہے۔

وہ مزدور پیشہ بچی نہیں تھی مگر اپنے مزدور باپ کی رانی ضرور تھی۔ اکلوتی شہزادی۔ دنیا اس کے لیے دھنک رنگ تھی۔ خوشیاں ابو کی مٹھی میں بند تھیں اور اپنے کاندھے پر اسے سوار کروا کے وہ اسے ہمیشہ بلندی اور بے فکری دکھاتے تھے۔ اسے کیا خبر کہ دنیا باپ کی آنکھوں سے دیکھنے میں کتنی بھلی تھی اور اب جب اپنی آنکھ کھول کر دیکھی تو کیسی بھدی۔۔۔ کریہہ۔۔۔

ابو کی ہائی ایس وین اب کوئی ڈرائیور چلانے لگا تھا۔ وہ روز شام کو پیسے دیتا مگر اتنے کم کیوں۔۔۔ اور یہ گاڑی اچانک اتنا خرچا کیوں مانگنے لگی تھی۔ حالانکہ نئی گاڑی نکلوائی تھی ابو نے۔۔۔

اور گاڑی کا اپنا بھی ایک حساب کتاب تھا۔ قسطیں بھی بھرنی تھیں۔

اور ایڈوانس رقم جو گاڑی لینے کی مد میں قرض لی گئی تھی۔ قرض خواہ دروازہ بجانے لگے تھے۔ دو افراد کے اتنے خرچے یقیناً "نہیں تھے مگر گاڑی اتنا کما نہیں رہی تھی، جتنا کھا رہی تھی۔ امی کو ڈرائیوروں کی چالوں کا بخوبی علم تھا مگر اس چال کا علم نہیں تھا۔ جس سے گیم پلٹی جا سکتی۔ بساط سمیٹی جا سکتی۔ یہاں تو زندگی سمٹ رہی تھی۔ خواہشیں، خواب کو دور چھوڑ کر بات ضرورت تک محدود ہو گئی تھی اور ضرورتیں کتنی بھی کم کر لی جائیں۔ پیٹ روٹی اور جسم کپڑا مانگتا ہے۔

"اپنے ماں باپ کے پاس چلی جاؤ صفیہ!" مالک مکان کی بیوی، ہمدرد تھی۔ امی زخمی ہنسی ہنس دیں۔

"آپ بھی اچھا مذاق کر لیتی ہیں بھابھی!"

"مذاق کیوں۔۔۔ میں بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہوں۔ عبدالمجید کے مرنے پر وہ آئے تھے، دیکھا تھا میں نے انہیں۔۔۔ سب بہت سلجھے ہوئے لوگ تھے۔

تمہاری امی منہ سے تو کچھ نہ بولیں مگر منہ پر دوپٹا رکھ کر مسلسل روتی رہی تھیں۔"

"وہ میری بیوگی پر نہیں روتی تھیں۔" صفیہ کی نگاہوں میں کاٹ تھی۔ "اس بات کا رونا آ رہا ہو گا۔ زندگی میں کبھی دوبارہ مجھے نہ دیکھنے کا جو عہد کیا تھا وہ ٹوٹ گیا۔ نجانے کس دل سے آئی تھیں۔"

"مائیں زیادہ دیر خفا نہیں رہتیں۔ اکیلی عورت ہو، بچی کا ساتھ ہے۔ آج تمہاری جوانی مشکل مرحلہ ہے۔ کل کو بیٹی نے تمہارے قد سے اونچا ہو جانا ہے۔ پھر کیا کرو گی تن تنہا۔" وہ صفیہ کو حقیقت سے آنکھیں چراتے دیکھ کر رہ نہ سکی تھی۔

"آپ کو کرایہ ٹائم پر مل رہا ہے ناں بھابھی! آپ میری فکر میں مت گھلیں۔"

"بدگمان ہونا ابھی سیکھا ہے یا پرانی عادت ہے۔" وہ مسکرا دی۔ صفیہ نے جواب نہ دیا۔ وہ کیا کہہ کر ہاں کا در کھٹکھٹاتیں۔ ان کا ننھی بچی کے ساتھ تنہا ہونا دنیا کو نظر آ رہا تھا۔ آنے والا وقت۔۔۔ وقت نہیں خطرہ۔۔۔

ان کی ماں کو خیال نہ آتا ہو گا۔ وہ جس شخص کے ساتھ زندگی بھر کا ساتھ نبھانے نکلی تھیں۔ اسے سفر کے آغاز ہی میں قضا نے جکڑ لیا۔

جب ماں کو کوئی ہول نہیں اٹھا۔۔۔ تو وہ کیسے درد جگاتیں۔

"تمہارے سسرال میں بھی تو ایک جیٹھ ہیں ناں بڑ
مالک مکان کی بیوی کو صبح و شام اس کی فکر رہتی تھی۔ وہ واقعی دردمندی سے سوچا کرتی تھی۔

"سات سال سے آپ کی کرایہ دار ہوں بھابھی۔۔۔ سب آئے گئے سے آپ واقف ہی ہیں۔ کسی کو آیا گیا دیکھا کیا؟" صفیہ کے لہجے میں تنفر گھل گیا۔

"تم نے انہیں اطلاع کی تھی؟"

"اطلاع کیسے کرتی۔۔۔ ایک نمبر تھا اسے ملایا تھا کئی بار۔ مگر وہ نمبر بند تھا۔"

"صفیہ! ان کا حق تھا کہ انہیں خبر ہو جاتی کہ پیارا بھائی دنیا سے چلا گیا۔"

"اس سے کیا ہوتا؟" صفیہ کے انداز میں ہٹ

دھری تھی۔
"تمہارے پاس کوئی ایڈریس وغیرہ نہیں ہے؟"
مالک مکان کی بیوی ہر پہلو سے سوچ رہی تھی۔
"مجھے صحیح طرح سے یاد نہیں ہے۔" صفیہ نے بے زاری سے کہا۔
"جو بھی..... جیسا بھی یاد ہے۔ مجھے لکھوا دو' میں تمہارے بھائی سے کہہ کر پتا کرواتی ہوں۔"
صفیہ کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مگر مالک مکان کی بیوی ٹھان چکی تھی۔ اسے آدھی ادھوری داستان ماضی کی خبر تھی۔ صفیہ..... اور مجید.....
مجید اپنے بھائی عبدالعزیز کی نسبت تعلیم سے بھاگا ہوا تھا۔ اسے گاڑیوں جیپوں سے دلچسپی تھی۔ وہ ریس میں حصہ لے' گاڑیاں بھگائے مگر یہ امیروں کے شوق تھے۔ عربی شیخ جب چولستان شکار کے لیے آتے تو وہ گاڑی کو ریتلے ٹیلوں پر بھگائے پھرتا۔ ماہر ڈرائیور تھا۔ مگر اپنی فور وہیل خریدنے کا خواب ادھورا رہ گیا۔ ریتلے ٹیلے سے جیپ الٹ گئی۔ جیپ کا کچھ بھی نہ بگڑا۔ مگر عبدالمجید کے بائیں بازو میں کہیں کوئی کسر رہ گئی۔ جو صرف اسے ہی محسوس ہوتی تھی۔
اب وہ شیخوں کے ہمراہ شکار پر جانے کا اہل نہیں رہا تھا۔
اس نے کچھ عرصہ حالت سوگ میں رہنے کے بعد بس اڈے پر جا کر دوست کی ہائی ایس وین ایک شہر سے دوسرے شہر چلانا شروع کر دی۔
مگر کہاں وہ اونچے نیچے خطرناک ٹیلوں' والے راستے..... اور کہاں سیاہ تارکول کی سیدھی سڑک..... ملتان سے بھاول پور..... بھاول پور سے ملتان۔
اتنی سیدھی لکیر جیسی زندگی..... عبدالمجید جوشیلا تھا۔ چیلنجز کا سامنا کرنے والا..... اور..... اور صفیہ چیلنج ہی بن گئی۔
وہ وین کی مسافر تھی۔ بیک ویو مرر سے دکھائی دیتی اور سائیڈ مرر سے بھی پھر ایک وقت ایسا آیا۔ مرر کے بغیر بھی ہر جگہ نظر آنے لگی۔
پانی کے گلاس میں عکس جھلکنے لگا۔
اور دل ہاتھوں میں آکر دھڑک اٹھا۔ اس کے لیے گاڑی چلانا مشکل ہو گیا وہ خیالوں میں بسنے لگی تھی۔ اس لیے بے دھیانی کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ سامنے لا کر بٹھائی جاتی تو افاقہ ہو سکتا تھا۔ عبدالمجید' بھائی عبدالعزیز کے سامنے پہنچ گیا۔
"شادی تو بہت اچھی بات ہے۔" وہ خوش ہو گئے۔
"مگر کس سے.....؟"
مجید نے جھٹ نام لے دیا۔ تفصیل بھی گوش گزار کر دی۔ عبدالعزیز خوشی خوشی رشتہ لے کر پہنچ گئے مگر ادھر سے صاف انکار.....
انکار کوئی جرم نہیں تھا مگر بے عزت کیوں کیا گیا۔
ایک پڑھا لکھا خاندان ایک ڈرائیور کو رشتہ کیسے دے سکتا تھا' جبکہ ان کے باقی داماد اور بیٹے بابو والی نوکری کرتے تھے۔ انہیں عبدالعزیز بہت اچھے لگے۔ بھائی عبدالمجید پسند نہیں آیا۔
عبدالعزیز نے ساری صورت حال کو تحمل سے دیکھا اور جانچا۔ لڑکی کے والدین غلط نہیں کہہ رہے تھے۔ انہیں وہ سب لوگ اچھے لگے تھے۔ سلجھے ہوئے' تمیزدار' اسکول کالج کے پڑھے ہوئے مگر اس کا کیا کیجیے کہ۔ اس خاندان کی بیٹی نے "عشق اسکول" کا میڈل گلے میں ڈال لیا تھا۔ اس نے اتنی محنت سے ڈگری حاصل کی اور کوئی اسے ماننے کو تیار نہیں۔ اس کی ڈگری کوئی جعلی تھوڑی تھی کہ تسلیم نہ کی جاتی۔

✡ ✡ ✡

عبدالعزیز نے شدید حیرت سے سینہ تان کے کھڑے عبدالمجید کو دیکھا اور اس کے عقب سے ذرا سا دکھائی دیتی صفیہ.....
عبدالعزیز نے صرف فلموں' اخباروں میں لڑکی بھگا کر لے آیا' جیسے جملے سنے پڑھے تھے۔ یوں اپنے سامنے دیکھا کبھی نہیں تھا۔
"میں تمہیں اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔" عبدالعزیز کو صفیہ کے والدین یاد آ رہے تھے۔

سارا گھرانہ... کیا بیتی ہوگی بیٹی کے اس قدم سے اس خاندان پر اور بیٹی کو اتنی ہمت دینے والا کون تھا۔ ان کا اپنا بھائی عبدالمجید۔

عبدالعزیز ابھی چار روز پہلے ہی تو بیٹی کے باپ بنے تھے۔ دل گداز تھا اور بیٹی کا باپ ہونا کیسی ذمہ داری ہے' اس کا احساس بھی نیا نیا تھا۔

اگر کل کو سمیرا عبدالعزیز بھی ایسا قدم اٹھالیتی۔ عبدالعزیز نے آج ہی تو بیٹی کا نام رکھا تھا۔ فقط سوچ کر ہی جھرجھری آگئی۔ صفیہ کے لیے دل میں نفرت ابھری اور عبدالمجید کے لیے شدید نفرت اور غصہ...

"اس گھر پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا آپ کا..." عبدالمجید نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" عبدالعزیز کا لہجہ تحمل کی حد کو چھوتا تھا۔ "میں گھر سے نکل جاتا ہوں تم رہو۔"

عبدالمجید بھونچکا رہ گیا۔ اس کے پاس اور جملے رہے ہی نہیں۔

☆ ☆ ☆

صفیہ سر پکڑے بیٹھی تھی۔ گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ ڈرائیور فرار اور گاڑی تھانے کے اندر... روز شام کو ملنے والے تھوڑے بہت پیسے کب سے بند تھے۔ مکان کا کرایہ... اسکول کی فیس... بلز... یہ تو ادا کرنے ہی تھے۔

پچھلے مہینے وین ورکشاپ بھی گئی تھی۔ صفیہ بل ادا نہیں کرسکی تھی۔ وہ رقم بھی ڈبل ہوچکی تھی اور مالک مکان کی مجبوریاں بھی بالکل جائز تھیں۔ اس نے اللہ نام کو گھر کرائے پر نہیں دیا تھا۔

آمدنی کا ذریعہ گاڑی تھی۔ قرض خواہ جب دل کرتا دروازہ بجادیتے تھے۔ گاڑی بیچ کر قرضہ اتار دوں۔ باقی پیسے سے خرچ چلاؤں مگر ایسے وہ کب تک پیسہ کھا سکے گی۔

حمیرا لاڈوں پلی بچی تھی مگر باپ کی موت نے اسے یک دم بڑا کردیا تھا۔ ماں اسے لاکھ نہ بتائے۔ اسے سب نظر آنے لگا تھا۔ وہ سوچنے لگی تھی' اس کی شوخی

سنجیدگی میں ڈھلنے لگی تھی۔ اس کا بچپن ختم ہورہا تھا۔

"بھائی صاحب سے کہیں' کسی طرح گاڑی چھڑوادیں بس..." صفیہ کا واحد حل گاڑی تھا۔

"وہ لگے ہوئے ہیں کوششوں میں... مگر..." مالک مکان کی بیوی نے جملہ ادھورا چھوڑدیا۔ "بہت مشکل کام ہے۔ پیسہ لگانا پڑے گا اور وہ ہے نہیں۔"

صفیہ کا حلق خشک ہوگیا۔ وہ کیا کرے۔ بھائی کو فون کرکے دیکھ لیا تھا۔ وہاں سے وہی جواب ملے جو اسے پہلے سے معلوم تھے۔

"کل ہی کی تو بات تھی... جب تم اپنی محبت کا بوجھ ہمارے کندھوں پر ڈال کر چلتی بنی تھیں۔ ہم آج تک دوبارہ کھڑے نہیں ہوسکے۔ لولی لنگڑی زندگی گزارتے ہیں صفیہ! تمہیں سہارا کیا دیں گے۔"

"مجھ سے افسانوں والی باتیں نہ کریں بھائی جان... میرا بھی حق ہے اس گھر پر..." صفیہ نے تنک کر یاد دلایا تھا۔ بھائی زہر خند ہوگیا۔

"جو فرض ادا نہ کرے' اسے حق کا سوال نہیں کرنا چاہیے صفیہ۔ ہماری عزت سنبھال کر رکھنا تمہارا فرض تھا۔ ہم تمہارا برا نہیں چاہتے تھے۔"

بھائی نے فون رکھا۔ پھر بند بھی کردیا۔

اس کا تو خیال تھا کہ وہ روئے گی دھوئے گی تو بھائی کہے گا۔ "میں آرہا ہوں لینے" مگر یہ کیا... وہ سناٹے کی کیفیت میں گھر گئی۔

اور پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ معاشی مسائل کھلے زخم کی طرح تھے۔ بڑھتے گئے... بگڑتے گئے۔ یہاں تک کہ کھانے کے لالے پڑگئے۔

مالک مکان کی بیوی بھی آگئی۔

"تمہارے بھائی کہتے ہیں' ہمیں اچھے کرائے دار مل رہے ہیں۔" (یعنی تم اپنا بندوبست کرلو۔)

"میں کہاں جاؤں گی بھابھی..." بہت دنوں سے چٹختی لکڑی ٹوٹ گئی۔ وہ بے دم ہوگئی۔ حمیرا کو خود سے لپٹا کر روتی چلی گئی۔

"والدین کا دل توڑنے والوں کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔" اس کے باپ نے کہا تھا۔ تب اس نے سوچا۔

"کیسا ظالم باپ ہے نکلتے نکلتے بددعا دے رہا ہے۔"

باپ نے بددعا نہیں دی تھی۔ بس بتایا تھا۔

"انکل نے اس ہفتے میں گھر خالی کرنے کا کہا ہے امی۔۔۔"

"ہوں۔۔۔"

"ہمارا کیا ہوگا۔۔۔ ہم تو۔۔۔" حمیرا کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ دروازہ بج رہا تھا۔ صفیہ نے سہم کر صورت دیکھی۔ قرض خواہ ہوں گے۔ وہ جن کا لہجہ بھی بدل گیا تھا اور نظریں بھی۔۔۔

"دیکھو۔۔۔ کون ہے۔" حمیرا نا چاہتے ہوئے اٹھی۔ ابو کے کچھ دوست اب عجیب طرح سے دیکھتے تھے۔ بارہ برس کی بچی کو دنیا اپنا نیا رنگ دکھا رہی تھی۔ اس نے نا چاہتے ہوئے دروازہ کھولا اور خود پیچھے ہی رہی۔

"عبدالمجید۔۔۔ عبدالمجید کا گھر یہی ہے؟" لرزش زدہ کچھ جانی پہچانی سی آواز۔۔۔ بھلا کس کی؟ وہ بری طرح چونکی تھی۔

"یہ عبدالمجید ڈرائیور کا گھر ہے نا۔" اب کی بار آواز میں بے تابی کا عنصر زیادہ تھا۔

"یہ آواز۔۔۔" حمیرا کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

"یہ تو۔۔۔"

اس نے دھاڑ سے دونوں پٹ کھول دیے۔ "ہائے۔۔۔ ابو!" اس کی چیخ نکل گئی۔ سامنے ابو کھڑے تھے۔ ہاں وہ ابو ہی تھے۔

اور ہاں وہ انہیں چھ ماہ بعد دیکھ رہی تھی۔۔۔ تو وہ تھوڑا بدل گئے تھے۔ بس تھوڑا سا۔ انہوں نے داڑھی رکھ لی تھی۔ سامنے سے بال کچھ کم اور سفید زیادہ ہوگئے تھے۔ وہ تھوڑے بدل گئے تھے مگر وہ اسی کے ابو تھے۔

"ایسے ہی لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔۔۔ کہ مرنے کے بعد کوئی واپس نہیں آتا۔" اس نے ایک چیخ ماری۔

"امی۔۔۔ امی۔۔۔ دیکھیں ابو آگئے۔"

وہ ابو سے لپٹ گئی۔ اوہ اللہ۔۔۔ وہی بھینی بھینی سی خوشبو۔۔۔ وہی چوڑا سینہ۔۔۔

"ابو! ابو!" اس کی چیخوں سے صفیہ باہر آگئی۔۔۔ کیا

حمیرا کا دماغ پلٹ گیا تھا۔ نہ جانے کس کو۔۔۔
"وہ۔۔۔" صفیہ کے قدم تھم گئے۔ سامنے کھڑا شخص۔۔۔ ہاں وہ ہو بہو عبدالمجید تھا مگر۔۔۔ وہ صفیہ کا شوہر عبدالمجید نہیں تھا۔ پر وہ حمیرا کا باپ ضرور تھا۔ تایا عبدالعزیز نے کسی کے بھی بتائے بنا حمیرا کو خود میں بھینچ لیا۔ اس کے حیران، بھیگی پلکوں والے چہرے کو ہاتھوں میں اٹھا کر چوم لیا۔

"یہ تمہارے ابو نہیں ہیں حمیرا۔۔۔ یہ تمہارے تایا ہیں۔۔۔" صفیہ کی آنکھوں سے سرد مہری جھلکتی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بس ایک ہی بار دیکھا تھا۔ اس رات جب وہ اور عبدالمجید پہلی بار گئے تھے اور لوٹا دیے گئے تھے۔

"نہیں۔۔۔ یہ میرے ابو ہی ہیں۔" حیرت سے ماں کے جملے کو سننے کے بعد حمیرا ذرا دور ہوئی تھی۔ اس نے غور سے دیکھا۔ عبدالعزیز دور نزدیک، دونوں صورتوں میں عبدالمجید ہی دکھائی دیتے تھے۔ پر امی کیا کہہ رہی تھیں۔

"میں نے فون کیا تھا۔۔۔ آپ کا نمبر بند تھا۔"

"میرا موبائل کھو گیا تھا۔ تم مجھے پیغام بھجوا دیتیں۔۔۔ میرا بھائی کیسی کسمپرسی میں۔۔۔" عبدالعزیز کی آواز گھٹ گئی۔ صفیہ بے تاثر چہرہ لیے کھڑی رہی۔

"تمہیں گھر آنا چاہیے تھا۔"

"وہ گھر جس کے دروازے کبھی آپ نے کھولے ہی نہیں۔"

"میں غصہ میں تھا۔۔۔" عبدالعزیز کو صفیہ کا نام تک بھی معلوم نہ تھا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے، غصہ صرف آپ کو آتا ہے۔"

"میں تو سوچتا تھا، وہ خوش و خرم زندگی گزار رہا ہے تو۔۔۔"

"ہاں خوش ہی تھا۔۔۔ ہم تینوں خوش تو تھے۔" صفیہ کرسی پر ٹک گئی۔

"مجھے ملا تھا ایک دو بار۔۔۔ میں نے سوچا، میں بڑا ہوں اسے میرے پاس آنا چاہیے۔۔۔"

"اور وہ یہ شکوہ کرتا رہا کہ بھائی نے مجھے بلایا تک نہیں۔۔۔" صفیہ کا لہجہ کاٹ دار تھا۔

حمیرا کو یہ گفتگو، یہ لہجے سب برے لگ رہے تھے۔ وہ ماں کو روکنا چاہتی تھی۔

"میں تمہیں لینے آیا ہوں۔"

"کہاں۔۔۔؟" صفیہ بری طرح چونکی۔

"گھر لے جانے کے لیے۔۔۔"

"گھر۔۔۔ کون سا گھر۔۔۔؟"

"میرا گھر۔۔۔ ہمارا گھر۔۔۔ میری بیٹی کا اصل گھر تو وہ ہے نا۔" انہوں نے حمیرا کے شانے پر بازو پھیلا دیے۔

"نہیں۔۔۔ ہم کہیں نہیں جا رہے۔ ہم اپنے گھر میں خوش ہیں اور ایک دوسرے کے لیے کافی ہیں۔" عبدالعزیز کی نگاہیں چاروں جانب بھٹکنے لگیں۔ اچھا خوب صورت مکان تھا۔

ہاں، وہ اپنا گھر کیوں چھوڑ کر جائے مگر وہ بھائی کی بیوہ اور بیٹی کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ دو الگ شہروں کا فاصلہ ہے بیچ میں۔

"امی غلط کہہ رہی ہیں، یہ ہمارا گھر نہیں ہے۔ کرائے کا گھر ہے اور اس ہفتے خالی کرنے کا نوٹس ملا ہے اور ابو کی گاڑی تھانے میں پڑی ہے اور ابو پر بہت زیادہ قرضہ بھی تھا۔ سب لوگ مانگنے آجاتے ہیں اور۔۔۔"

حمیرا نے چند جملوں میں سب کہہ دیا۔ صفیہ کو روکنے کا موقع تک نہ ملا۔

"اپنا سامان باندھ لو۔۔۔ ہم اپنے گھر جائیں گے۔"

عبدالعزیز نے اپنی واسکٹ اتار دی۔ حمیرا نے جھٹ پکڑ کر کھونٹی سے ٹانک دی۔ وہ صحن میں بچھی ننگی چارپائی پر دراز ہو گئے۔ حمیرا بھاگ کر تکیہ اٹھا لائی۔ چادر بھی بچھانا چاہتی تھی۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے بٹھا لیا۔

"کون سی جماعت میں پڑھتی ہو؟" رونے سے ان کی آواز بھاری ہو چکی تھی۔ وہ تو اپنے کسی کام سے اس شہر میں آئے تھے۔ بس اڈے پر اترے تو شکل کی شدید

مشابہت کی بنا پر کسی نے عبدالمجید کہہ کر آواز دی۔۔۔ عبدالعزیز نے بس مڑ کر یہ کہا "وہ عبدالمجید نہیں عبدالعزیز ہیں۔ عبدالمجید ان کا چھوٹا بھائی ہے۔"

تب پکارنے والے نے بتایا۔۔۔ "ہے۔۔۔ نہیں۔۔۔ تھا۔" آگے کی کہانی تو فضول تھی۔ اصل بات یہ تھی' اکلوتے بھائی نے ہے سے تھا کا سفر بھی طے کر لیا اور وہ بے خبر۔۔۔

سر پر خاک ڈالتے یہاں تک آئے تھے۔ آدھی کہانی بس اڈے پر پتا لگی تھی' آدھی یہاں۔۔۔

"اچھا بھلا بیٹھا تھا سب کے بیچ۔۔۔ چائے پی' بس ایک دم کہنے لگا' دل گھبرا رہا ہے۔ پانی پلایا' پنکھا جھلا مگر وہ تو جی آنکھیں بند' ختم ہو گیا۔"

عبدالعزیز کا دھیان حمیرا سے ہٹ گیا۔ ناراضی کو اتنا نہیں بڑھنا چاہیے کہ ناراضی برقرار رہے اور زندگی ختم ہو جائے۔ ناراضی زندگی کا ایک رویہ ہو سکتی ہے مگر زندگی تو نہیں۔۔۔ ناراضی' نفرت' لاتعلقی' محبت' فکر' توجہ لوگ نفرت کو قبر تک نبھاتے ہیں۔ بجری نی لاشوں کو نکال کر سڑکوں پر روندتے ہیں مگر کچھ لوگ محبت کو مرنے کے بعد بھی نبھا رہے ہیں۔ تاج محل بنا دیتے ہیں یادگار۔ نفرت کو نبھانے والا ایک نہ ایک دن پچھتاتا ہے۔ محبت کو نبھانے والے محبت کو پوجنے والے کبھی نہیں پچھتاتے اور دوسرے غلطیاں سدھارنے میں کتنا بھی وقت گزر جائے۔ دیر کبھی نہیں ہوتی۔

عبدالعزیز نے چبھتی نگاہ سے خود کو مسلسل دیکھتی صفیہ کو دیکھا تو ہاتھ کی گھڑی کی طرف اشارہ کر کے دیر ہو جانے کا خدشہ بتایا۔

"تیاری کرو چھوٹی بھابھی! گھر جانا ہے۔"

"گھر میں کیسے۔۔۔؟ وہ گھر تو آپ کا ہے۔ عبدالمجید نے تو اپنا۔۔۔" عبدالعزیز نے گھبرا کر ہاتھ اٹھا دیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے صفیہ اپنا جملہ پورا کرے۔

"وہ گھر ہمارا ہے حمیرا بیٹی کا اصل گھر وہی ہے۔"

✲ ✲ ✲

"رازوں کو چھپ کر پینے والے دن کو یوں ہی پکڑے

جاتے ہیں۔" معید نے اخبار چہرے کے سامنے پھیلاتے ہوئے جیسے کسی خبر پر تبصرہ کیا تھا مگر حمیرا کے آگ لگ گئی۔

"تم مجھے شرابی کہہ رہے ہو۔۔۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔۔۔ اپنے گھر کی لڑکی کے بارے میں ایسی بات کہتے ہوئے۔ تمہیں ذرا لحاظ نہ آیا معید۔۔۔ تمہارا ذرا دل نہ کانپا۔"

"اور تمہیں اپنی بوڑھی ماں کو دھوکا دیتے ہوئے ذرا لاج نہ آئی۔ ذرا دل نہ کانپا۔" معید نے اخبار زور سے بند کیا۔

"میں صرف کولڈ ڈرنک پی رہی تھی۔" حمیرا نے ایک ایک لفظ کو چبایا۔

"چھپ کر کیا جانے والا کام جرم ہوتا ہے۔" معید کا جواب ترنت آیا۔

"یہ کس کا قول ہے؟" حمیرا نے ابرو سکیڑے۔

"ظاہر ہے۔ ایسے سنہرے الفاظ میں ہی کہوں گا' یہاں اور کون اس قابل ہے۔"

"سنہرا تو پیتل بھی ہوتا ہے۔" حمیرا نے اسے چڑایا۔

"ہم تو جس حال میں ہیں' خوش ہیں اور شکر ہے سونا نہ ہوئے۔ تم جیسی ناک کان میں لٹکا کر گھومتی۔"

"میں اور تمہیں۔۔۔" حمیرا نے جیسے شدید حیرانی اور تاسف سے شہادت کی انگلی اپنے سینے پر رکھ کر تصدیق چاہی۔

"کبھی زندگی میں چار پیسے آ گئے تو میں تو جھانجھ بھی سونے کی بنواؤں گی۔" اسے فوراً" اپنی پرانی خواہش یاد آگئی۔

"دیکھا! اسی لیے میں نے کہا۔ شکر ہے ہم سونا نہ ہوئے۔ ورنہ تم تو پیروں میں رول دیتیں۔" معید نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ تمہاری اتنی خودشناسی پسند آئی معید عبدالعزیز' ورنہ سجانے والیاں تو ٹکا جھومر بنا کر ماتھے پر بھی سجا لیتی ہیں مگر افسوس۔۔۔"

وہ جیسے تاسف میں گھر گئی۔ معید کچھ نہ بولا۔

مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔

"اب بولتے کیوں نہیں۔"

"کیا بولوں۔۔۔؟" معید نے اخبار دوبارہ کھول لیا۔

"خود شناسی تکلیف سے بچالیتی ہے۔ میں جانتا ہوں میرا رنگ اتر چکا ہے۔ کوئی مجھے ماتھے کا جھومر ٹیکا بنا کر نہیں سجائے گا۔ اور ماتھا ہی کیوں۔ میرے اندر تو اتنی چمک بھی باقی نہیں رہی کہ کوئی جوتی کا پھول بنالے۔ جانے دو حمیرا عبدالمجید۔۔۔ مجھے پینسل ہی رہنے دو۔"

ایسے رلا دینے والے جملے اس نے مسکرا کر کہے تھے۔ حمیرا کا سانس اٹک گیا۔ وہ اسے گھور رہی تھی اور آنکھوں میں پانی بھرنے لگا تھا۔

"دیکھا۔۔۔" اس نے اس کے کندھے پر اخبار کا رول مارا۔ "کر دیا نا تمہیں لاجواب۔" آنسو چھلک نہ جائیں۔ اس ڈر سے اس نے پلکوں کے جھپکنے کو قصداً" روک رکھا تھا۔

"لاجواب کے بچے۔۔۔ میں تایا ابو کو بتاتی ہوں جا کر، تم گندی باتیں کر رہے ہو۔ بلکہ بڑی امی سے بھی تمہارا علاج کرواؤں گی۔" حمیرا کی نگاہیں کچن سے آتی بڑی امی پر پڑیں۔

"شکایتی ٹٹو۔ پہلے اپنا بندوبست کرو۔۔۔ تمہاری امی کے قدم برآمدے میں پڑ ہی چکے ہیں اور ان کا ہر بڑھتا قدم تمہاری شامت لا رہا ہے۔"

"ہائے۔۔۔" حمیرا کو سب بھول بھال کر اپنی فکر پڑی۔ "وہ امی۔۔۔" ان کے ہاتھ میں کوک کی وہی خالی بوتل تھی جو رات وہ بستر میں چھپ کر شوارما کے ساتھ پی رہی تھی۔ چہرے کی بے پناہ سنجیدگی ان کے غصے کا مظہر تھی۔

حمیرا اور معید کے درمیان پلاسٹک ٹیبل پڑی تھی۔ اسی پر بوتل رکھ دی۔ بچے ہوئے شوارمے کا آخری لقمہ۔۔۔ (یہ بھی نہ جانے کیسے بچ گیا تھا۔۔۔ منہ میں جانے سے۔۔۔)

حمیرا کی نگاہیں امی کے چہرے پر تھیں۔ کیسی لاتعلقی سی تھی۔ دل میں طوفان۔۔۔ جوار بھاٹے۔

"کھانے سے پہلے چیزیں چھپا کر رکھی تھیں" تو انہیں ٹھکانے لگانے میں بھی تو احتیاط لازم تھی مگر رات وہ خیالوں میں ماضی کے سفر پر نکل گئی۔ آنکھ نہ جانے کب لگی۔ رات یادوں کی بارات میں اشکوں کے پھول سجے تھے۔ اس کی آنکھیں کچھ سوجی سوجی تھیں۔ چغل خوری کرتی سی۔ وہ آنکھ کھلتے ہی اس چیز کو محسوس کر کے سرپٹ غسل خانے کی جانب بھاگی تھی۔ کوئی روئی آنکھوں پر سوال نہ کر دے۔ ٹھنڈے پانی کے چھپاکوں نے بچت کر دی مگر۔۔۔ آف۔۔۔ جب وہ تولیے سے منہ پونچھتی باہر نکلی۔ صفیہ اس کے بیڈ کی دائیں جانب کھڑی تھیں اور زمین پر بے یقینی سے دیکھ رہی تھیں۔

ماں کے تاثرات اتنے عجیب سے تھے کہ حمیرا جھٹ ان کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ حمیرا نے ماں کو دیکھا۔ ماں نے حمیرا کو۔۔۔ اور وہ نظریں کیا نظریں تھیں۔ سانو چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

زمین پر کوک کی بوتل اوندھی پڑی تھی اور ایک براؤن سی لکیر میں محلول جم سا گیا تھا۔ شوارما کی تھیلی بھی تھی۔

"بھاگ حمیرا۔۔۔" اس کے اندر کا وارننگ الارم درست بجا۔۔۔ سر پر پیر رکھ کر بھاگی۔۔۔ تو برآمدے میں آکر پناہ لی۔

"معید راتوں کو چھپ چھپ کر شوارمے کھاتا ہے؟" صفیہ نے تیکھی نظر ڈالی۔ معید بری طرح چونکا۔

"میں۔۔۔" اس نے بے ساختہ تصدیق چاہی۔

"اچھا الزام مجھ پر لگایا تھا۔" اس کی گردن حمیرا کی سمت گھومی۔ حمیرا نے بے ساختہ سر نفی میں ہلایا۔ پھر نظر صفیہ پر پڑ گئی۔ گردن اثبات میں ہلی۔

صفیہ کے ضبط کا خاتمہ ہوا۔ وہ شروع ہو گئیں۔

"کام کاج کوئی کرنا ہے نہیں۔۔۔ پہلے چلو کتابیں کھول کر پڑھنے کا ڈراما چل جاتا تھا۔ وہ بھی پرچے ختم ہو گئے تو کتابیں اٹھا کر طاق میں رکھ دیں۔"

"ڈراما۔۔۔ طاق۔۔۔ یعنی اس کا پڑھنا ڈراما لگتا تھا امی کو۔۔۔ نہیں نہیں نہیں۔"

اس کے چہرے سے حال دل عیاں تھا۔ اوپر سے یہ معید اس کی بے عزتی کس قدر محو ہو کر عزت سے سن رہا تھا۔ جیسے امی خطبہ دے رہی ہوں۔ لیکن عورتیں خطبہ تو نہیں دے سکتیں۔ یا دے سکتی ہیں۔ پتا کرنا پڑے گا۔

اس نے ایک بار پھر معید کو دیکھا۔ دونوں بازو سینے کے گرد لپیٹے وہ کتنا مودب لگ رہا تھا۔ صفیہ کے ہر ہر لفظ سے اتفاق کرتا ہوا۔ حمیرا نے قصداً" نگاہیں ادھر ادھر گھمائیں۔ اوہو۔۔۔ کھلی کھڑکی سے سمیرا دکھائی دے رہی تھی۔ حمیرا نے وال کلاک دیکھا۔ ہاں اس کا اسکول جانے کا ٹائم ہو چکا تھا۔ ابھی یہ باہر آئے گی اور امی کا پارہ مزید اوپر چڑھ جائے گا۔

"ارے اسی طرح کھاتی رہی تو بم بن جائے گی بم۔۔۔ رنگ بھی بس گزارا ہے۔ اس پر چربی کا پہاڑ۔۔۔"

"اونہہ! اچھا خاصا رنگ ہے۔ مجھے کشمیری سیب ہو کر کیا کرنا ہے۔ میں پنجاب کی جٹی ہوں امی جٹی۔۔۔ مجھے گندم کی بالی جیسا سنہرا لگنا چاہیے۔ کیوں معید۔۔۔؟"

سمیرا کمرے سے باہر تشریف لا رہی تھی۔ اسے ایسا کچھ بولنا تھا جس سے امی پوری کی پوری اس کی طرف متوجہ ہو جاتیں مگر کہاں سمیرا کے ملبوس سے اٹھتی دھیمی دھیمی مہک امی کی گردن بے ساختہ گھومی۔

"ہاں بالکل ٹھیک۔ گندم سا سنہرا لگنا چاہیے۔۔۔ مگر اس فصل میں تو لگتا ہے۔ آگ لگ گئی ہے۔" معید اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

"تم۔۔۔!" اس نے جبڑے بھینچے۔

"ہائے سمیرا۔۔۔" وہ معید کو چھوڑ کر سمیرا کی جانب متوجہ ہوئی۔ اپنا بیگ نزاکت سے رکھ کر وہ چائے کے گھونٹ لے رہی تھی۔ بسکٹ دو انگلیوں کے بیچ پھنسا اپنی قسمت پر نازاں تھا۔ گلابی نرم ہاتھ پر پیچ رنگ کی نیل پاش سجی تھی۔ اس کا سوٹ بھی پیچ اور براؤن کنٹراسٹ میں تھا۔

حمیرا نے بطور خاص نیچے ہو کر اس کے پیر دیکھے۔ براؤن انگوٹھے والی چپل اور پیچ نیل پالش۔۔۔ پر افسوس امی بھی وہیں دیکھ رہی تھیں۔

اس نے اپنے پیر چھپانے کی کوشش کی مگر یہ کہاں ممکن تھا۔ تایا ابو کی رف جوتی گیارہ نمبر۔۔۔ امی کے تاثرات مزید بگڑے۔ اس نے ٹانگیں اوپر کر کے کرسی پر چوکڑی مار لی تھی۔

"نہ بیٹھنے کی تمیز۔ نہ چلنے پھرنے کی۔۔۔ کوئی ایک گن ہو تو شکر مناؤں۔" "ارے کل کو میرے ہی گلے پڑ جانا ہے۔ کیسے کروں گی اگلے گھر کا۔۔۔ نہ طور طریقہ۔۔۔ جسم پھیل کر ہمالیہ بن جائے گا۔"

"ہمالیہ۔۔۔!" معید کو اچھو لگ گیا۔ "یعنی کہ ہمالیہ۔۔۔ کوہ ہمالیہ۔۔۔" اس نے حمیرا کا کھلا منہ دیکھا۔ جو خود بھی بھونچکی رہ گئی تھی۔ امی کم بولتی تھیں مگر یہ نئی اختراع خصوصاً" اس کے موٹاپے کے لیے۔۔۔

معید نے اپنے دونوں گال دانتوں میں کس لیے۔ مبادا ہنسی صفیہ اور حمیرا دونوں کو پتا دے۔ صفیہ کا تو دھیان نہیں تھا۔ حمیرا کو نظر آ رہا تھا مگر اس وقت امی کیسے چپ ہوں گی۔

"میرے پاس کون سے نوٹ جڑے ہیں کہ دان جہیز کا لالچ دے کر کسی کو روکوں گی۔"

"مجھے لالچی کمینوں سے شادی کرنی بھی نہیں۔" حمیرا نے منہ بسورا۔

"لالچی بھی کمینہ بھی۔۔۔" معید حیران ہوا۔

"جو لالچی ہوتا ہے وہ دراصل پہلے حد درجہ کمینہ ہوتا ہے اور بعد میں صرف بے غیرت رہ جاتا ہے۔" حمیرا نے ذرا جھک کر سرگوشی کی۔

"اوہ!" معید فوراً" قائل ہوا۔ "کیا کہنے...."

"باپ بھائی بھی سر پر نہیں ہے کہ کوئی آسرا رہے۔ تم نے میرے سینے پر مونگ دلنا ہے بتا ہے مجھے...." صفیہ کی آواز میں غصے کے ساتھ لرزش بھی آگئی۔ حمیرا چونکی۔ معید نے بھی سنجیدگی اختیار کی۔ حمیرا کو گھور کے اشارہ کیا کہ وہ سوری کرے۔

"کتنی بار کہا جائے گا چھوٹی بھابھی.... باپ نہ ہونے کا ڈراوا بچی کو نہ دیا کرو.... تمہیں میں نظر نہیں آتا۔" حمیرا کے اٹھنے سے پہلے یہ تایا ابو کی آواز تھی۔

صفیہ چونکی تھیں اور چہرے کے تاثرات "فوراً" مٹا دیے تھے۔

"تایا ابو...." حمیرا فوراً" اٹھ کر ان سے لپٹ گئی' سراسر مصنوعی انداز....

"بیٹیوں کے نصیب نوٹوں سے نہیں دعاؤں سے سجتے ہیں اور میری ساری دعائیں اپنے بچوں کے لیے ہیں۔"

"ڈھن میں سے ایک پھونک مجھے مار دیں ابو...." سمیرا دوپٹا سیٹ کرکے آگئی۔ وہ اسکول جانے کے لیے گھر سے نکل رہی تھی۔

ابو نے مسکرا کر اسے دیکھا اور خواہش پوری کردی۔ "سمیرا! لنچ تو لے جاؤ۔" سمیرا کی امی کچن سے باہر آئیں۔ صفیہ جب بھی بیٹی کے ساتھ الجھ رہی ہوتیں وہ قصداً" منظر سے ہٹ جایا کرتیں۔ وہ گھر کی بڑی بھی تھیں اور مالکن بھی.... مگر صفیہ نے بہت پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ وہ ماں بیٹی کے بیچ نہ بولا کریں۔

"اس کے کھانے پینے کو مت ٹوکا کرو۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ یہی تو کھانے پینے کے دن ہیں۔ ابھی کا کھایا بڑھاپے میں کام آتا ہے اور دوسرے لکھنے پڑھنے والے بچوں کو یوں بھی زیادہ غذائیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ابھی تو بے چاری امتحانوں سے فارغ ہوئی ہے اور تم اسے اس قدر سنانے لگی ہو۔" صفیہ خاموش رہیں۔

"اور سب سے اہم بات یہ کہ تم ہر وقت اس کی شکل کے بارے میں کیا کہتی ہو۔ کیا کمی ہے میری بیٹی میں۔ لاکھوں میں ایک ہے لاکھوں میں۔"

صفیہ واپسی کے لیے مڑ گئیں۔ انہیں گری ہوئی کولڈ ڈرنک پر پوچا لگانا تھا۔

اور یہ سچ تھا' حمیرا میں کوئی کمی نہیں تھی مگر یہ کیوں تھا کہ سمیرا میں ہر چیز کی زیادتی تھی۔ حسن کی زیادتی' نزاکت کی زیادتی....

وہ سر سے پیر تک حسن تھی.... اس کے چلنے پھرنے' بولنے چالنے' کھانے پینے ہر شے سے ادا جھلکتی تھی۔

جبکہ حمیرا وہ قطعاً" کوئی موٹی ووٹی نہیں تھی۔ گندمی بے داغ رنگت والی قدرے بھرے جسم کی لڑکی.... اپنی عمر کے حساب سے اس پر یہ جسم بچتا تھا مگر اس کا کیا کریئے کہ صفیہ اسے ہمیشہ سمیرا کے تقابل میں دیکھتی تھیں۔ سمیرا کے لیے دل میں رشک و حسد پیدا ہوتا تو حمیرا کے اوپر غصہ اترتا۔

حمیرا فطرتاً" ایک بے نیاز لڑکی تھی.... مست مگن.... ہنستی مسکراتی۔ جسے اپنی شخصیت پر اعتماد تھا۔ اپنے وجود پر ناز.... وہ خود شناس بھی تھی اور سب سے مزے کی بات یہ تھی کہ اسے خبر تھی۔ صفیہ دراصل سمیرا کے حسن کے آگے حمیرا کو کم دیکھ کر تڑپ اٹھتی ہیں۔

اور یہ صفیہ کی سراسر بے وقوفی تھی۔ سمیرا' حمیرا اپنی اپنی جگہ دو الگ مگر مکمل شخصیت تھیں۔ ان کا تقابل نرا احمقانہ پن تھا مگر یہ بات صفیہ کو کون سمجھاتا۔

"وہ ناراض ہوگئی ہے۔" بڑی امی ان دونوں کے بیچ آکر بیٹھ گئیں۔ "میں نے لاکر دی تھیں نا تم کو وہ چیزیں۔"

"آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا امی!" معید نے کہا۔ بڑی امی نے سر ہلایا۔ حمیرا' معید کو گھورنے لگی۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)